یہ کتاب انگریزی زبان کے مشہور مصنف "رائڈر ہیگرڈ" کی تصنیف ہے، اس میں بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی اور ان کی آزادی کی داستان کو ناول کے پیرایہ میں دکھایا گیا ہے، بنی اسرائیل پر مصریوں کے مظالم، فرعون کو اسرائیلی انبیاء کی تنبیہ، فرعونیوں کا تمرد، ان پر مصائب کا نزول، حق و باطل کی معرکہ آرائی، فرعون کی غرقابی اور بنی اسرائیل کی آزادی وغیرہ، کل واقعات کو نہایت دلچسپ طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، ان خشک واقعات کو پرلطف بنانے کے لئے مصنف نے فرعون کے ولی عہد سیٹی اور ایک معصوم اور مظلوم اسرائیلی لڑکی میرائین کی داستان عشق و محبت بھی شامل کردی ہے، شاہزادہ سیٹی اپنے خاندان کے برعکس نہایت حمد، منصف مزاج، حق پرست، دنیاوی شان و شکوہ سے بے نیاز اور اپنی قوم کے خلاف مظلوم بنی اسرائیل کا ہمدرد اور ان کی آزادی میں مددگار ہے، اس کی سزا میں اسے بڑی بڑی آزمایشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تاج و تخت سے محروم کیا جاتا ہے، چنانچہ فرعون کی موت کے بعد اس کے بجائے شاہی خاندان کا ایک دوسرا رکن عمن میس تخت پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن شاہزادہ سیٹی حق کی حمایت سے باز نہیں آتا، یہی فرعون مع خدم و حشم کے غرق ہوتا ہے اس کے بعد شاہزادہ سیٹی کو تخت ملتا ہے، عین اس وقت اس کی محبوبہ میرائین مصریوں کے سحر کے اثر سے مرجاتی ہے، شاہزادہ اس کے مردہ جسم کو تاج پہنا کر تخت نشین کرتا ہے، اور اس کے بعد ہی خود بھی راہئی عدم ہوتا ہے، اس ناول میں فراعنہ کے جلال و جبروت، عہد فراعنہ کی سحر و ساحری، اور قدیم مصری تمدن کی پوری تصویر آگئی ہے، کوئی واقعہ بغیر آب و رنگ دیئے ہوئے افسانہ نہیں بن سکتا، اسلئے اس میں اصل واقعات پر بہت کچھ اضافے ہیں، لیکن افسانہ نہایت دلچسپ ہے، اور مترجم نے کامیاب ترجمہ کیا ہے،

"م"

جلد ۴۳ | ماہ صفر المظفر ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۹ء | عدد ۴

مضامین

شذرات

وسط مارچ مین اڈیٹر معارف کو سفر مین زخم چشم پہنچا، یہ فقرہ حقیقت و مجاز دونون پہلودن سے صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ یہ واقعہ دلی اور لکھنؤ کے مابین پیش آیا جس کی وجہ سے دلی اور لکھنؤ دونون شہرون کے آنکھون کے خاص طبیبون کا علاج فوراً ہی ممکن ہوسکا اور خطرہ کا فوراً انسداد ہوگیا، ع

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

آنکھون کی شدید سرخی ہلکی ہوچکی ہے، لیکن ابھی تک لکھنے پڑھنے مین پوری احتیاط برتی جاتی ہے، امید ہے کہ احباب جواب خط نہ ملنے کے اس عذر گناہ کو قبول فرمائینگے،

دار العلوم ندوۃ العلماء کے قدیم طلبہ نے سب سے پہلی دفعہ لکھنؤ سے باہر ایک دوسرے شہر بلکہ دوسرے صوبہ (پھلواری ضلع پٹنہ) میں اس مرتبہ اپنا اجلاس منعقد کیا ہے، ان سطرون کے لکھوانے تک اجلاس کی روئداد معلوم نہین ہوسکی، مگر امید ہے کہ ان پرجوش نوجوان بھائیون نے عربی تعلیم و عربی مدرسون اور خاص طور سے ندوہ کی اصلاحی تحریک پر عاقلانہ اور عادلانہ تجویزین منظور کی ہونگی،

افسوس ہے کہ ہماری قوم کے گفتار و کردار میں ابھی تک توازن پیدا نہین ہوا جس طرف کی کوئی ہوا چلتی ہے اسی طرف سب کے سب

ایک دفعہ جھک پڑتے ہین، اور یہ نہین سمجھتے کہ قوم کی مختلف ضرورتین ہین اور ہر ضرورت اپنی جگہ پر ضروری ہے، اب آجکل سیاسیات کی جو صحیح یا غلط آندھی چل رہی ہے اس مین سب اڑے چلے جارہے ہین، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف یہی ایک چیز ایسی ہے جو قوم کو جلا یا مار سکتی ہے حالانکہ جماعت کی حیثیت بالکل ایک فرد کے مانند ہے، جس طرح ایک زندہ آدمی کو اپنے زندہ رہنے کے لئے ہوا، پانی، غذا اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے اسی طرح جماعت کو بھی اپنی زندگی کے لئے ایمانی و اخلاقی طاقت، مالی قوت، جہاد کی روح، اور صحیح تعلیمی مقصد بہت سی غذاؤن کی ضرورت ہے، ان مین سے کسی ایک چیز کو لے کر دوسری چیزون سے غفلت برتنا قومی خودکشی ہے،

ورم اور موٹاپے دونون مین جسم کا حصہ کچھ بڑھ جاتا ہے، لیکن ورم اس کا نام ہے کہ بدن کا کوئی ایک عضو یا اس عضو کا کوئی حصہ بڑھکر بدن مین عیب یا درد پیدا کرے، اور موٹاپے خصوصاً صحت و تندرستی کے موٹاپے مین بدن کے سارے اعضا مین متوازن نشو و نما ہوتا ہے، قومون کا زندگی کے کسی ایک پہلو پر اتنا زور دینا کہ دوسرے پہلو نگاہون سے اوجھل ہوجائین، قومی صحت کی فربہی نہین بلکہ بیماری کا ورم ہے،

آجکل اسلامی تہذیب و تمدن اور زمانۂ حال کے سب سے ممتاز اور دلپسند لفظ کلچر کی حفاظت کی بڑی دھوم ہے، مگر معلوم ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کی حفاظت کا کام کہان انجام پاتا ہے، یونیورسٹیون، کالجون، لیگون، اور کانگرسون میں نہیں، بلکہ ٹوٹے پھوٹے عربی مدرسون کی فرسودہ چہار دیواری مین یہی وہ حصار تھے جہان سے فرنگی تہذیب و تمدن

کے شدید حملون کا مقابلہ کیا گیا، اور اب بھی یہی وہ قلعے ہیں جہان سے اس کی آیندہ حفاظت کا انتظام کیا جاسکتا ہے، اس لئے ان عربی مدرسون کی ظاہری تباہ حالی کو کم نگاہی سے نہ دیکھئے، بلکہ یقین کیجئے کہ ہندوستان کے اسلامی مدرسے ہی ہندوستان مین اسلامی تعلیم و تمدن کے مضبوط مورچے ہیں، جنکو اسلامی کلچر کی تباہی کا رونا ہے، ان کو چاہئے کہ پلیٹ فارمون کی دردبھری تقریرون کو چھوڑکر اپنی بھری جیبوں کو ان قلعوں کی تیاری اور ان کے استحکام پر صرف کرین،

جن لوگون کو عربی مدرسون کے پرانے طرز تعلیم اور نصاب پر شدید اعتراضات ہین، انھین معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا بڑے سے بڑا عربی مدرسہ بھی ہر قسم کی ضروری اصلاح کے لئے تیار ہے، نصاب کی خرابیان اب دلیلون کی محتاج نہیں رہیں، ندوۃ العلماء نے اسکے متعلق جو لٹریچر پیدا کیا ہی، اس سے بڑھکر وہ لٹریچر ہے جسکو زمانہ کے ہاتھون نے لکھکر پیش کردیا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ تمام اہم عربی مدرسون کے ارکان ایک جگہ مل کر بیٹھین اور اس مسئلہ پر غور کریں،

اوپر ہم نے جو مختصر سی خوہش پیش کی ہی، ہم کو معلوم ہی کہ اس حالت کو پہنچ جانے پر بھی اُن کا قبول ہونا مشکل ہی، کیونکہ سب کچھ ہوجانے پر بھی جماعتی انانیت کی بو ہمارے دماغوں سے نہیں نکلی ہی اور جب تک پوری جماعت مل کر اس مسئلہ کو طے نہ کرے گی، یہ مسئلہ ناطے شدہ رہیگا،

ادھر گرمیون میں دو نہینے مئی اور جون اڈیٹر معارف کا قیام دارالمصنفین سے باہر رہیگا، اسلئے معارف کے متعلق جملہ خط وکتابت اڈیٹر کے بجائے دفتر دارالمصنفین سے کی جائے، تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو،

شاہانہ التفات نامہ

اتحاد بین المسلمین کی زبردست خواہش

دارالمصنفین کے خدمات کی تحسین،

مارچ ۱۹۳۸ء کے معارف میں "بدعات محرم" پر اعلیحضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کی ایک تحریر دلپذیر، بصیرت افزاے معارف ہوئی تھی، اور معارف نے اس پر ایک مختصر مقدمہ کے لکھنے کی سعادت پائی تھی، یہ مقدمۂ تحریر جب اعلیحضرت کی نظر اشرف سے گذرا تو پسند فرمایا اور اپنے دست خاص مبارک سے یہ التفات نامہ رقم فرماکر خاکسار اڈیٹر کو اوج اقبال بخشا،

اس التفات نامہ میں جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اعلیحضرت کے خاطر انور میں مختلف اسلامی طبقوں کے درمیان اتحاد کا کتنا عمیق جذبہ ہے، ساتھ ہی خدام علم کی عزت و توقیر جو مسلمان بادشاہون کا خاصہ رہی ہی، اس رقیمۂ کریمہ کی سطر سطر سے کس طرح ہویدا ہے،

توقیعِ خسروی

۱۵ صفر ۱۳۵۸ھ

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی،

السلام علیکم۔ میری نظر سے معارف کا پرچہ گذرا بابت مارچ سنہ ۱۹۳۹ء جو کہ ماہانہ اعظم گڈہ سے نکلتا ہے، اس میں میرے مضمون "صحیح عزاداری حسینؑ" کو نہ صرف طبع کیا گیا بلکہ چند سطور بطور مقدمہ اس کے متعلق لکھے گئے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہوش بلگرامی کے ذریعہ کہ مولوی صاحب میرے دوسرے مضمون زیر عنوان "شان ماہ محرم الحرام" کو بھی اپنے پرچہ مین آیندہ جگہ دینے والے ہیں، اور اس کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کرینگے، سبحان اللہ اگر اس قسم کے علماء و فضلا و فقہا طبقۂ اسلام مین دکھائی دیں جو کہ وسعت نظر سے کام لے کر اپنے مذہب و عقائد کے نکتہ و اسرار کو عوام پر ظاہر کرتے رہین تو کیا کہنا کہ ان کی یہ مذہبی خدمت قابل اور منصف مزاج گروہ کے ہان ضرور قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی، اور دوسری دنیا مین ان کو کچھ نہ کچھ اس کا اجر مل کر رہے گا کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

مجھے یہ بھی سنکر افسوس ہوا کہ آجکل مولوی صاحب کی آنکھ خراب ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تالیف و تصنیف کے کام مین ہرج واقع ہو رہا ہے، مگر اس کے ساتھ اس قسم کا کام جو اب تک انجام پایا ہے، وہ بھی کچھ کم نہین ہے، بلکہ قوم و ملت کی بہت کچھ خدمت کیگئی ہے، اس سے بحث نہین کہ اس کے قدردان بھی اس زمانہ مین کوئی ہین یا نہین،

"آصف سابع"

مقالات

عرب اور امریکہ

(۲)

ماورائے بحرِ ظلمات

عرب کے بے آب ریگستان سے اسلامی فتوحات کا جو سیلاب چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اٹھا تھا، وہ ساتوین صدی عیسوی کے وسط میں افریقیہ و مغرب اقصیٰ اور اندلس کے صحراؤن اور میدانون سے گذر کر بحرِ ظلمات کے ساحل پر آکر رکا، مگر بلند ہمت عرب کشورستان کی ہمت اب بھی اس فطری روک کے پاس آکر کم نہ ہوئی، مغرب اقصیٰ کے فاتح عقبہ نے بحرِ ظلمات کے پانی میں گھوڑا کھڑا کر کے کہا کہ "خداوندا اگر مجھے معلوم ہوتا، کہ اس کے بعد بھی تیرا کوئی ملک ہے، تو میں ذوالقرنین کی طرح وہان بھی تیری توحید کی دعوت لیکر جاتا" (المونس فی اخبار تونس ص ۲۵)

اندلس کا فاتح طارق فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کا آقا موسیٰ اس کو روکتا ہے تو جواب دیتا ہے، کہ جب تک بحرِ محیط کی دیوار ہمارے قدم نہ روک لیگی ہم آگے بڑھتے جائینگے[1]

ماورائے بحرِ ظلمات سفر کا تخیل عربوں اور مغربی و افریقی مسلمانوں میں ذوالقرنین کے قصہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا، یہ کہانی اتنی پھیلی کہ علم ہیئت کی کتابوں تک میں درج ہے، کہتے ہین، کہ ذوالقرنین نے ملکِ مغرب میں پہونچکر اپنا جہاز بحرِ ظلمات کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا، وہ اس پار کے ایک جہاز کو گرفتار کر کے لے آیا جس پر ماورائے بحرِ ظلمات کے کچھ باشندے سوار تھے، ذوالقرنین نے ان سے ان کے ملک کا حال دریافت کیا، رصدگاہ مراغہ کا عالم ہیئت شارح

[1] نفح الطیب ج ۱ ص ۱۱۳ مصر

بوجنی اس قصہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے،

"یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان میں بڑے بڑے دریا، اور اونچے اونچے پہاڑ، اور صحارئی حائل ہوں، جوان کی خبر ہم تک نہیں آنے دیتے، ہاں دو جنوبی ربعوں میں سے ایک میں کچھ آبادی بیان کیجاتی ہے، اور وہ جو ذوالقرنین کے زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ بظاہر بے اصل معلوم ہوتا ہے"

(مقالہ ثانیہ فی بیان الارض)

لیکن اس قسم کی کہانیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، چنانچہ اسپین وافریقہ کے سواحل میں مغرورین ومغررین (فریب خوردہ) کے نام سے ایک جماعت ہی قائم ہو گئی، جو اپنے کو مصیبتوں میں ڈال کر اس بحر محیط کے سفر کے لئے روانہ ہوتی تھی، پھر وہ اس میں فنا ہو جاتی تھی، یا کامیاب واپس آتی تھی،

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع (نوین صدی عیسوی کے آخر اور دسوین صدی عیسوی کے شروع) میں مسعودی اپنی مروج الذہب میں اس قسم کے واقعات کیلئے اپنی دوسری تصانیف کا حوالہ دیتا ہے،

وقد اتینا علی ذکرھا فی کتابنا	اور ہم نے اپنی کتاب اخبار الزمان
فی اخبار الزمان وفی اخبار	میں اور ان لوگوں کے حالات میں ان
من غرّبہ وخاطر بنفسہ و	واقعات کو بیان کیا ہے جنھون نے اپنے
من نجا منھم ومن تلف	آپ کو فریب دیا، اور اپنے آپ کو جوکھوں
وما شاھد وامنہ وماراوا،	میں ڈالا، اوران میں سے جو بچا اور جو ہلاک
	ہوا، اور انھوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا

اس کے بعد کہتا ہے،

واذا منھم رجل من اھل الاندلس	اوران میں اندلس کے رہنے والوں
یقال لہ خشخاش وکان من	میں سے ایک شخص تھا جس کو خشخاس کہکر
فتیان قرطبۃ واحداثھم فجمع	پکارا جاتا تھا، وہ قرطبہ کے نوجوانوں
جماعۃ من احداثھا ورکب	میں سے تھا، اس نے قرطبہ کے ونوجوانوں
بھم مراکب استعدھا فی ھذا	کی ایک جماعت بنائی، اوران کو لیکران
البحر المحیط فغاب فیہ مدۃ ثم	کشتیوں میں سوار ہوا جن کو اس نے
انثنی بغنائم واسعۃ وخبرہ	بحر محیط میں اس غرض کے لئے تیار رکھا
مشھور عند اھل الاندلس،	تھا، وہ ایک زمانہ تک غائب رہا، پھر
(جلد اصفحہ ۱۵۱ پیرس)	بہت سا مال غنیمت لیکر لوٹا، اوس کا واقعہ اہل اندلس میں مشہور ہے

ادریسی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ نے نزہتہ المشتاق میں اندلس کے جغرافیہ میں تین موقعوں پر ان مغرورین یعنی فریب خوردہ جہاز رانون کا ذکر کیا ہے (صفحات ۵۵-۱۶۵، ۱۸۴) یہ بھی لکھا ہے کہ امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشقین کے امیر البحر احمد بن عمر معروف بہ رقم الاوز (نقش بط) نے بحر ظلمات کے ایک جزیرہ پر فوج کشی تھی، مگر کامیابی کے پہلے ہی وہ مر گیا، (صفحہ ۵۵)

ادریسی ایک موقع پر بحر ظلمات کے ذکر میں لکھتا ہے،

"اس بحر ظلمات کے پیچھے جو کچھ ہے، اس کو کوئی نہیں جانتا، اور نہ کسی آدمی کو صحیح واقفیت ہے، کیونکہ اس کو عبور کرنا سخت مشکل ہے، اس کی فضا میں بڑی تاریکی اور اسکی موجیں نہایت سخت اور اس کے خطرات بہت، اور اس کے جانور خطرناک، اور اسکی ہوائیں ہیجان انگیز ہیں، اس میں بہت سے جزیرے ہیں، کچھ آباد، کچھ سمندر کے اندر، اور کوئی

جہاز راں اس کو عرض میں قطع نہیں کرتا، اور نہ اس میں گھستا ہے، البتہ اسکے ساحل
کے طول کے کنارے کنارے اس سے لگ کر چلتا ہے" (ص ۱۶۵)

اب بحر ظلمات میں یہ کون سے جزیرے ہیں؟ کیا امریکن جزائر ویسٹ انڈیز، نیو فاؤنڈ لینڈ، گرین لینڈ وغیرہ ہو سکتے ہیں،

لشبونہ (لسبن ساحل پرتگال) کے ذکر میں ادریسی ان فریب خوردہ جہاز رانوں کا ایک عجیب قصہ سناتا ہے کہتا ہے :-

"اور اسی شہر لسبن میں فریب خوردہ لوگ اس لئے بحر ظلمات میں سوار ہوئے تھے، تاکہ پتہ لگائیں، کہ اس میں کیا ہے، اور کہاں جاکر ختم ہوتا ہے، شہر لسبن میں ایک پھاٹک یا گلی (درب) ہے، جس کا نام فریب کھانے والوں کا درب ہے، اور ان کا قصہ یہ ہے، کہ آٹھ آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے، بار برداری کا ایک جہاز بنایا، اور اس میں پانی اور توشہ اتنا رکھ لیا، جو مہینوں کے لئے کافی تھا، پھر اس جہاز میں سوار ہو کر ایک مناسب موسم میں روانہ ہوئے، گیارہ دن کے بعد ایک ایسے پانی میں پہونچے، جو سخت موجوں والا تھا، وہاں کی ہوائیں مکدر تھیں، روشنی ماند تھی، تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے، تو اپنے بادبانوں کو دوسرے ہاتھ کی سمت پلٹ دیا، اور سمندر میں جنوب کی طرف چلتے رہے، تو بکریوں والے ایک جزیرہ میں پہونچ گئے، وہاں بیشمار بکریاں تھیں، جن کو کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا نہ تھا، تو وہ جزیرہ میں آئے، وہاں چشمہ ملا، اور جنگلی انجیر، انھوں نے ان بکریوں میں سے کچھ کو ذبح کیا، تو ان کا گوشت بہت ہی کڑوا نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے، ان کی کھالیں لے لیں، اور جنوب کی سمت میں ۱۲ دن اور چلے، ان کو

ایک جزیرہ ملا، جہاں آبادی اور کھیتی تھی، تو وہ اس جزیرہ کو دیکھنے چلے، ابھی کچھ ہی دور چلے تھے، کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں نے ان کو گھیر لیا، اور ان کو پکڑ کر جہاز ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے، وہاں ایک گھر میں جاکر اتارا، وہاں سرخ رنگ (اشقر) کم لیکن سیدھے بال والے لمبے قد کے آدمی دیکھے، ان کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی، تو وہ لوگ تین دن ایک گھر میں قید رہے، چوتھے دن ان کے پاس ایک آدمی آیا، جو عربی میں باتیں کرتا تھا، تو اس نے ان کا حال دریافت کیا، اور یہ کہ کیوں آئے اور کہاں سے آئے، اور تمہارا وطن کہاں ہے، انھوں نے اپنا پورا حال بتایا، اس نے ان سے بھلائی کا وعدہ کیا، اور بتایا کہ وہ بادشاہ کا ترجمان ہے، دوسرے دن ان کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اس نے ان کا حال پوچھا، تو وہی بتایا جو کل ترجمان کو بتا چکے تھے، کہ وہ اس سمندر میں اسلئے گھسے تھے، کہ دیکھیں اس میں کیا کیا عجائبات ہیں، اور اس کے حالات کیا ہیں، اور اس کی حد دریافت کریں، یہ سنکر بادشاہ ہنسا، اور ترجمان کے ذریعہ سے ان کو بتایا کہ اس کے باپ نے اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا تھا، کہ وہ سمندر کے عرض میں ایک مہینہ تک چلتے رہیں، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اور وہ ناکام واپس آئے، پھر بادشاہ نے ترجمان سے کہا کہ اُن سے بھلائی کا وعدہ کرے، اور بادشاہ کیساتھ حُسنِ ظن پیدا کرے، اس نے ایسا ہی کیا، پھر وہ اس قید خانہ میں لے آئے گئے، یہاں تک کہ وہ موسم آیا جب پچھوا ہوا چلتی ہے، تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر، اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک مدت تک سمندر میں چلاتے رہے، ان کا گمان ہو کہ تین دن اور تین رات وہ چلے ہوں گے، یہاں تک کہ وہ ایک خشکی میں پہنچائے گئے، وہاں ان کی مشکیں کسی گئیں، اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے یہاں تک

کر دن نکلا، اور روشنی ہوئی، اور ہم بندھے ہونے کے سبب سے سخت تکلیف اور بدحالی میں تھے، پھر ہم نے لوگوں کی آوازیں سنیں، تو چیخے، تو وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں، اور ہمارا حال دریافت کیا، ہم نے بتایا، یہ لوگ بربر تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ تم جانتے ہو، کہ تمھارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے؟ اونھوں نے کہا نہیں اونھوں نے کہا دو مہینہ کی مسافت، یہ سن کر ان فریب خوردہ جہاز رانوں میں سے ایک کی زبان سے وااسفی (اے میرا افسوس) نکل گیا، تو اس مقام کا نام اسفی پڑ گیا اور وہ مغرب اقصیٰ کے بندرگاہ کا نام ہے[1]،

جزئی اغلاط اور دونون کے اندازہ سے قطع نظر کر کے کیا ہم اس مقام کو جہان تک یہ فریب خوردہ جہاز ران پہونچے تھے، شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں، اور سرخ رنگ کے انسان وہی تو نہیں جن کا نام غلطی سے ریڈ انڈینس (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے، جو وہاں کے اصلی باشندے ہیں،

ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ آٹھویں صدی میں بحر محیط کے ایک سفر کا حال لکھتا ہے، جس میں اہل فرنگ کے چند جہاز بحر محیط کے کسی جزیرہ میں اتفاقاً پہنچ گئے تھے، چونکہ بحر محیط کے اندر یا انتہا پر جزائر خالدات کے علاوہ کوئی اور نام معلوم نہ تھا، اس لئے اس کے اندر کی ہر آبادی کو اور خشکی کو جزائر خالدات کہہ دیتے تھے، چنانچہ وہ مقدمہ میں کہتا ہے،

بحر محیط میں بہت سے جزیرے ہیں، جن میں تین بڑے اور مشہور ہین، اور کہا جاتا ہے کہ وہ آباد ہیں، اور ہم کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری چودہویں صدی عیسوی) کے بیچ میں اہل فرنگ کے چند جہاز ادھر سے گذرے اور انھوں نے

[1] نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق صفۃ افریقیۃ والاندلس ص۱۸۱ لائیڈن۔

وہاں لوٹ مار کی، اور وہاں کے کچھ باشندوں کو پکڑ کر لائے، اور مراکش کے سواحل پر ان کو بیچا، اور وہان سے وہ سلطان کے پاس پہنچے، جب ان لوگون نے عربی سیکھ لی، تو انھوں نے اپنے جزیرہ کا حال بتایا، کہ وہ کاشتکاری کے لئے زمین سینگ سے کھودتے ہیں، اور ان کے یہاں لوہا نہیں ہے، جَو کھاتے ہیں، اور ان کے مویشی بھیڑئیں ہیں، اور لڑائی میں پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں، اور آفتاب کو پوجتے ہیں"،

اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے، اور صحیح کہتا ہے،

ولا یوقف علیٰ مکان ھذہ الجزائر الا بالعثور لا بالقصد الیھا، (ص۴۵)

ان جزیرون کا ٹھیک پتہ نہیں معلوم اتفاقاً وہ ملجاتے ہیں، بالارادہ نہیں ملتے،

اسکی وجہ یہ بتاتا ہے، کہ جہاز ہوا کا رخ جاننے، ستاروں کی سمت معلوم کرنے اور سواحل کے بحری نقشوں کی مدد سے چلتے ہیں،

وھذا کلہ مفقود فی البحر المحیط، (ص۴۵)

اور یہ تمام سامان بحر محیط میں مفقود ہیں،

"اسی لئے جہاز اوس کے بیچ میں ہو کر نہیں چلتے، کیونکہ اگر سواحل کا منظر آنکھوں سے دور ہو جائے، تو واپس آنے کی راہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی اس سمندر کی فضا میں اور اس کے پانی کی سطح پر اتنے بخارات رہتے ہیں، جو جہازوں کو چلنے نہیں دیتے، اور آفتاب کی روشنی پہونچنے نہیں پاتی، اسی لئے اس میں راہ پانا، اور اس کا معلوم ہونا مشکل ہے، (مقدمہ ص۴۵)

ان تمام قصوں کو ممکن ہے کہ دلچسپ کہانیوں ہی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا لیکن

آجکل امریکہ کے کولمبس کی دریافت کی جو تنقیدی تاریخیں لکھی جارہی ہیں، اونھوں نے ان کہانیوں کو سنجیدہ تاریخ بنا دینے کی سند پیدا کردی ہے،

نئی تحقیقات امریکہ کے انکشاف کی جو تنقیدی تاریخیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نئی اور پرانی دنیا میں کولمبس سے پہلے سے تعلقات قائم تھے، ان تعلقات کی تعمیر میں کون کون قوموں نے حصہ لیا، اسکی دریافت تاریخی اور اثری ذریعوں سے اب تک کی گئی تھی، لیکن ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو وینیر (Leo Wiener) کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کا نام "افریقہ اور امریکہ کی دریافت" ہے، اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں، موصوف نے امریکہ میں پرانی آنیوالی قوموں کی دریافت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے، انھوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں کی اصلی زبان کی فیلالوجیکل تحقیقات کے ذریعہ سے یہ پتہ لگایا ہے، کہ امریکہ کے باشندوں کی پرانی زبان وقتاً فوقتاً کن کن زبانوں سے مانوس و متاثر ہوتی رہی ہے، وینیر صاحب چھبیس انسانی زبانوں میں بآسانی گفتگو کرسکتے ہیں، اور امریکہ کی پرانی زبان کے بڑے ماہر ہیں، اس کتاب کا خلاصہ انگریزی رسالہ "ورلڈ ٹوڈے" کے فروری سنہ ۲۶ء میں چھپا تھا، جس کا عربی ترجمہ المقتطف اگست سنہ ۲۶ء میں اور اردو ترجمہ معارف اگست سنہ ۱۹۲۶ء اور پھر اگست سنہ ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا،

وینیر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی فرانسیسی، ہسپانی، اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ ہیں، وہ عربی زبان ہے، یہ الفاظ ان کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۲۹۰ء کے قریب اس میں داخل ہوئے ہیں، اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اس کے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے، وینیر نے کاغذی دستاویزوں

سے ثابت کیا ہے، کہ کولمبس سے پہلے بحراوقیانوس میں تجارتی جہازرانی ہوتی تھی، مگر تاجر و سوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی ان بحری مہموں کو چھپاتے تھے،

کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں، وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے، کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا، بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے، کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے طلائی سکے جس کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملاکر بناتے تھے) دکھائی "گوننیس" اس وقت کی افریقہ کی زبان میں سونے کے ان ٹکڑوں کو کہتے تھے، جن کی شکل میں سونا ساحل گنی (غانہ) سے یورپ میں لایا جاتا تھا قدرتی طور پر سونے کے یہ ٹکڑے دیکھ کر کولمبس متحیر ہوگیا، کیونکہ وہ دراصل اسی سونے، ہاتھی دانت، اور قیمتی سامان کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا، اس نے امریکہ کے باشندوں سے دریافت کیا، کہ اونھوں نے وہ سونا کہاں سے پایا، اس کے جواب میں انھوں نے کہا "ہم نے یہ سونا کالے سوداگروں سے لیا ہے، جو جنوب مشرق سے یہاں آئے تھے" کولمبس کو گمان ہوا، کہ وہ سونے کی اصلی کان بتانے سے گریز کرتے ہیں، تیسرے سفر میں اس نے پھر وہی سوال کیا، اور وہی جواب پایا، اور آخر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، کہ پرانے امریکیوں کے جواب درست تھے، ابتدائی "گوننیس" جو فرانسیسی اور پرتگالی گنی کے ساحل سے لاتے تھے، خالص سونے کے نہیں ہوتے تھے، بلکہ غانہ والے اس میں اسی کے برابر تانبہ ملا دیتے تھے، جب کولمبس کی لائی ہوئی "گوننیس" کا کیمیائی امتحان کیا گیا، تو اس میں سونے اور تانبے کا وہی تناسب نکلا جو غانہ (گنی) کے لائے ہوئے گوننیس میں تھا،

یہ طلائی "ٹکڑے" دراصل افریقہ ہی سے آئے تھے، ایسے ہی جو حبشی اسکو وہاں ملے وہ افریقہ ہی سے آئے ہونگے، جہازرانوں کے کپتانوں کے ہر سفر سے پایا جاتا ہے، کہ ان خلاصی حبشیوں کی

موجودگی ضروری تھی، وہ بطور ترجمان استعمال کئے جاتے تھے، کولمبس بھی ان میں سے چند کو پہلے سفر میں ساتھ لے گیا تھا، امریکہ جاکر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے موجود ہیں یہی وہ لوگ تھے جن کو جنوب مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا، انہی کے ساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہونچے تھے، اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ، عربی پودے، اور عربی تہذیب وہاں پہنچی،

پہلے آثار قدیمہ کے ماہرون کا یہ تنہا بیان تھا، اور اب زبانوں کے محقق بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں، اور دونوں کا متفقہ دعوی ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ نئی دنیا افریقی عربی تمدن سے بہت حد تک متاثر ہوچکی تھی

امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں، "ازٹ" اور "مایہ" جو افریقہ کی عربی تہذیب کی حامل تھیں، معلوم نہیں، ان کی اصلیت کیا ہے، مگر یہ نام صحیح عربی ناموں کی تحریف معلوم ہوتی ہے، پہلا نام ازد ہے، اور دوسرا نام معاویہ ہے، ازد کی نسبت پہلے ہم لکھ چکے ہیں[1]، کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمان سے افریقہ اور مڈگاسکر کے بحری جہاز ران تھے، اور بہادری سے اپنے جہاز بحر بربرہ میں چلایا کرتے تھے،

بہرحال رسالہ مذکور وینیر کی تحقیق کا خلاصہ آگے ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"ازٹ اور مایہ کی تہذیبیں دراصل امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں، اور ان کا زمانہ سنہ ۱۱۵۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک قرار دیا جاتا ہے"،

ہم نے مغرورین کے سفر کا جو زمانہ لکھا ہے، وہ اسی کے قریب قریب ہوتا ہے:۔

"عربی تہذیب نویں صدی عیسوی میں اپنے معراج پر تھی، اور ۱۱۰۰ء میں صحرائے اعظم کو عبور کرکے افریقہ کے مغربی منڈینگو (Mandingo) کا تجارتی صوبہ قائم کرچکی

[1] عربوں کی جہاز رانی صفحہ ۱۶

تھی، اس کے مقابل میں امریکہ کا صوبہ میچوکن[1] (Michoacan) تھا، جو خلیج میکسیکو کے ساحل پر واقع تھا، عربی الفاظ کی آمیزش سب سے پہلے میچوکن میں پائی جاتی ہے، اور وہ الفاظ منڈینگو کی زبان میں ملتے ہیں، اور یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے، کہ یہ الفاظ ایسے ہیں، جو ایک تجارتی کارندہ یا سیاح استعمال کرتا ہے مثلاً جادو، ادویہ، مذہب اور نظام حکومت کے متعلق،

یہ نتیجہ کہ منڈینگو اور میچوکن کے درمیان آمد ورفت بھی لابدی ہے، ہر طرح تازہ تحقیقات سے اسکی تائید ہوتی ہے، ازٹ اور مایہ کی تہذیبوں کا یکلخت انحطاط اس کا ایک اور ثبوت ہے، چونکہ یہ ایک طرح کی نوخیز تہذیبیں تھیں، جس وقت ان کا اپنے اصلی مرکز سے قطع تعلق ہوگیا، ان میں تنزل آنا شروع ہوگیا، یہ امر کہ یہ تعلق صرف تجارتی تھا، اس بات سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربی تہذیب کا اثر میچوکن میں داخل ہوکر صرف تجارتی راستوں کے آس پاس ہی پایا جاتا ہے، اور یہ صرف خالص عربی کا اثر تھا"

اگر مسٹر وینیر کی ان لسانی تحقیقات کے نتائج درست ہیں، تو ہم نے انکی تصدیق کیلئے جو مقدمات گذشتہ صفحوں میں فراہم کئے ہیں، وہ بھی قابل قبول ہیں،

پرانے عربوں کی امریکہ میں آبادی،

اس نظریہ کو سن کر لوگوں کا بجا سوال تھا، کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمد و رفت تھی، تو امریکہ میں ان کے نشانات کیوں نہیں ملتے، اور انکی کسی نوآبادی کا پتہ یہاں کیوں نہیں لگتا، مگر خدا کی قدرت دیکھئے، کہ عین اس وقت جب یہ سطریں زیر تحریر تھیں، امریکہ کے عربی اخبار "الہدیٰ" نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا، جسکی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی، اور خود ہندوستان کے اردو اخبارات نے

[1] میکسیکو میں ایک ریاست (بحرالکاہل (پاسفک) سے ملحق،

اس کے اقتباسات دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع کئے، براعظم امریکہ میں وہان کی مہذب ریاستوں اور متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل اور گاؤں ہیں، جہان اس براعظم کے پرانے باشندے آباد ہیں، اور جواب تک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور جہانتک اب تک کسی یوروپین سیاح کے قدم نہیں پہونچے ہیں، خصوصیت کیساتھ یہ مقامات مکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں، اخبارات راوی ہیں[1]:-

"ایک شامی عرب تاجر مکسیکو کے چاپاس اور ٹباسلا کے صوبوں میں پھیری کر کے سوداگری کا مال بیچتا تھا، حال میں اتفاقاً اس کا گذر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا، جہاں آمد و رفت جاری نہیں تھی، چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا، وہاں ایک قبیلہ دیکھا، رات ہو چکی تھی، سوداگر نے اپنی زبان میں ان جنگلی باشندوں سے شب بھر رہنے کی درخواست کی، اس کے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمھاری بولی نہیں سمجھتے، عرب سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سن کر حیرت میں آگیا، اس نے ان سے عربی میں گفتگو کی، اور انھوں نے کہا کہ وہ صدیوں سے اس جنگل میں آباد ہیں، اور عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے"

سوداگر مذکور کا بیان ہے، کہ یہ قبیلہ اب تک اپنے عربی رسم و رواج پر قائم ہے، اور خالص عرب ہے، یہ خبر مکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی، تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ کی تحقیقِ حال کے لئے روانہ کیا ہے،

یہ قبیلہ چار سو برس سے زیادہ سے یہان آباد ہے، اور دوسرے ہمسایہ قبیلوں سے الگ

[1] المقطم دسمبر ۱۹۳۰ء، والمساء مورخہ ۲۰ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء و پیام کلکتہ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۰ء،

تھلگ زندگی بسر کرتا ہے،

اس خبر سے عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات اندلس اور پرتگال کے عرب "مغرورین" (فریب خوردہ جہازرانوں) کی کہانیوں کی تصدیق ہوتی ہے،

اس سلسلہ کی آخری خبر یہ ہے، کہ لبنان کے عیسائی فاضل انطون یوسف بشارہ نے جنھوں نے مکسیکو میں سکونت اختیار کر لی ہے، مصر کے اخباروں میں پچھلے سال یہ اطلاع شائع کی ہے، اور جو الفتح مصر مورخہ ۳۰ جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ ص ۲۴۶ میں چھپی ہے، کہ وہ مکسیکو میں اپنی زمین واقع ریوکرسی (مکسیکو) میں کھدائی کرا رہے تھے، کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے، جو تحقیق کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے، اس دریافت کا وہان کے علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے،

کولمبس اور امریکہ یہ تحقیق تو الگ رہی، مشہور یوں ہی ہے کہ کولمبس پہلا شخص ہے جس نے اس نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملایا، مگر اس نے جو کچھ پایا، اتفاقیہ پایا کہ ع

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے،

کولمبس ہندوستان اور چین کی تلاش میں تھا، کہ امریکہ پہونچ گیا، کسی علمی استدلال سے وہ اس نتیجہ پر نہین پہونچا، اور بقول ایک اطالوی عالمِ ہیئت اور مستشرق کرلونلینو کے کہ "کولمبس عربوں کی مقدار مسافت اور میل کے صحیح اندازہ کے نہ جاننے کی مبارک غلطی سے امریکہ پہنچ گیا" فاضل اطالوی عالم کی اصل عبارت عربی کا ترجمہ یہ ہے:-

"لاطینی کتابون کے عربی ترجموں کے ذریعہ سے مامون نے ایک درجہ فلکی کی پیمائش کا جو اندازہ نکالا تھا، یعنی ۵۶ ۲/۳ میل، وہ یورپ میں بھی مشہور ہوا، اور جس طرح یونانی اور سریانی کتابوں کے عربی ترجمہ کے ذریعہ سے یونانی میل کی مقدار نہ جاننے سے اہلِ عرب نے غلطی کی، اسی طرح چودہویں اور پندرہوین صدی میں عربی میل کی

صحیح مقدار نہ سمجھنے کے سبب سے اہل یوروپ غلطیوں میں مبتلا ہو گئے، انہی میں کرسٹوفر کولمبس امریکہ کا پتہ لگانے والا بھی تھا، اس نے ایک درجہ کے ۵۶⅔ عربی میل کو لاطینی ۵۶⅔ میل سمجھ کر مغربی یوروپ اور ایشیا کے شرقی سواحل کی مسافت اس سے بہت کم سمجھی جو حقیقت میں ہے، اگر یہ غلطی نہ ہوتی، تو کبھی ممکن نہ تھا، کہ مغربی یوروپ سے اوقیانوس میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھکر صرف چند مہینوں کی خوراک لیکر چین پہونچنے کا تخیل کرتا، آخر اس سفر سے رُک کر وہ اس غلطی کی بدولت امریکہ کے جدید براعظم میں پہونچ گیا، جس نے ایک نئے انسانی دور ترقی کا آغاز کیا، یہ غلطی کیسی مبارک تھی جس نے دنیا کو عظیم الشان فوائد سے مالا مال کر دیا[1]"

کولمبس اس وقت ظاہر ہوا، جب اہل اسپین اندلسی عربوں سے آخری لڑائی لڑ رہے تھے اور انکو اپنے ملک سے نکال رہے تھے، اسکا زمانہ اسپین اور پرتگال میں گذرا، ایک معمولی سیاح سے جہازراں تک پہنچا، وہ ہیئت جغرافیہ اور سفرنامہ کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، ایک اسپینی خاتون سے شادی کی، اس ذریعہ سے اسپین کے ایک عیسائی خانقاہ کے جغرافیہ دان راہب سے ملا، پھر اس کا پیشہ یہ ہو گیا، کہ وہ جہازرانوں کے لئے بحری نقشے تیار کرکے فروخت کرتا تھا، اور بحری مسافروں اور جہازرانوں سے معلومات جمع کرتا تھا، عین اسی عربی اور اسپینی لڑائی کے زمانہ میں وہ ملکہ اسپین سے نئے جزیرہ اور نئے بحری راستوں کے لئے مدد کا طالب ہوا، اس زمانہ میں اسپین اور پرتگال کے عیسائی موروں، (مسلمان عربوں) کو نہ صرف اسپین، بلکہ تمام سواحل و جزائر سے نکالنے کے لئے ہر طرف بحری بیڑے بھیج رہے تھے، سواحل بحر محیط سے لیکر کل سواحل افریقہ سے یہانتک کہ عرب اور ہندوستان کے سواحل تک سے عرب جہازرانوں کو لڑ لڑ کر نکال رہے تھے، اور ان سے

[1] خطبات علم الفلک عند العرب صفحہ ۲۹۳

بحری نقشے حاصل کرتے تھے، وہ سونے کی کان والے افریقی ساحل تک بھی گیا تھا، جہاں افریقی اور زنگی ملاح بکثرت پرتگالیوں کو ملتے تھے،

بہرحال اس زمانہ میں یوروپ اور خصوصاً اسپین اور پرتگال میں علم ہیئت، ہندسہ، جغرافیہ اور بحری سفر کے معلومات جو کچھ تھے، وہ عربی تصنیفات یا ان کے تراجم کے ذریعے تھے جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں میں مورخین نے بیان کیا ہے، اور اس طرح کولمبس اپنے نظریہ کی ترتیب و تکمیل میں تمام تر عربوں ہی کی تحقیقات سے مستفید ہوا،

ارمغان احباب

یعنے

دلی اور اسکے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۴)

مدرسہ روز شنبہ ششم شعبان، صبح کو کھل گیا، ہم اطمینان سے حوائج ضروری سے فارغ ہوئے اس کے بعد مدرسہ گئے، امتحان ہو رہا تھا، پرچے تقسیم کر دیئے گئے تھے اور طلبہ جوابات لکھ رہے تھے، سب طلبہ الگ الگ بٹھائے گئے تھے، چار دن سے امتحان ہو رہا تھا ابھی کم سے کم دس بارہ دن تک ہوگا، تقریباً تین سو طلبہ مدرسہ میں ہیں، اکثر مدرسہ کے مکانوں میں رہتے ہیں اور بعض مسجدوں میں ان میں دو سو سے زیادہ باہر کے ہیں، اور ڈیڑھ سو ان میں وہ ہیں جن کے خورد و نوش کا مدرسہ متکفل ہے، کپڑے اور جوتہ اور فرش و روشنی وغیرہ کا سامان بھی مدرسہ سے دیا جاتا ہے، جاڑے میں جڑاول بھی ملتی ہے، بہرحال تمام ضروریات کا متکفل مدرسہ ہے، اور پچاس وہ ہیں، جو اپنے پاس سے کھاتے ہیں،

مدرسین اس مدرسہ میں سات مدرس عربی کے ہیں جن کو تنخواہ ملتی ہے اور ایک مدرس بلا تنخواہ بطور اعانت کے پڑھاتے ہیں، مدرسین عربی میں سے مدرس اول مولینا محمود حسن صاحب ہیں، یہ بزرگ مولوی

ذوالفقار علی صاحب ادیب مشہور کے صاحبزادے ہیں، اور مولینا قاسم صاحب مرحوم کے عمدہ شاگردوں میں ہیں، ان کی استعداد ہر فن میں خصوصاً دینیات میں اعلیٰ درجہ کی ہے، سب طالب العلم انکی تعریف کرتے ہیں، دوسرے مولوی خلیل احمد صاحب ہیں، جو مدرس دوم ہیں، یہ مولینا مملوک العلی صاحب کے نواسے اور مولینا محمد یعقوب صاحب کے بھانجے ہیں، یہ بھی فاضل مستعد ہیں، تیسرے مولوی غلام رسول ہیں، یہ ولایتی ہیں، عقلیات میں ان کی استعداد بہت اچھی ہے، اور اکثر فلسفہ بھی پڑھاتے ہیں، چوتھے مولوی حافظ احمد صاحب مولینا محمد قاسم صاحب کے صاحبزادے ہیں، پانچویں مولوی عزیز الرحمن صاحب ہیں، یہ مفتی مدرسہ ہیں، کار افتاء انہی کے متعلق ہے، اسی طور پر اور مدرس ہیں، دو مدرس فارسی کے ہیں، اور دو قرآن مجید کے، ایک مہتمم مدرسہ ہے، آجکل مولوی محمد منیر صاحب ہیں، یہ مولینا مظہر صاحب مرحوم و مولوی محمد احسن صاحب نانوتوی کے چھوٹے بھائی ہیں، دفتر انہی کے متعلق ہے، دفتر میں دو محرر ہیں، ایک جلد ساز ایک دربان ایک خاکروب ایک حجام، ملازمین کی تنخواہ کی میزان کل [1] دو ہزار دو سو چونسٹھ روپیہ ہے،

ارباب شوریٰ ارباب شوریٰ آٹھ اشخاص ہیں، حضرت مولینا رشید احمد صاحب سرپرست مدرسہ، جناب حاجی محمد عابد صاحب، جناب مولوی ذوالفقار علی صاحب، جناب مولوی محمد احسن صاحب نانوتوی، جناب حکیم ضیاء الدین احمد صاحب رامپوری، حاجی شیخ ظہور الدین صاحب دیوبندی، حاجی منشی فضل حق صاحب، جناب مولوی فضل الرحمن صاحب دیوبندی،

کتب خانہ انتظام مدرسہ کا نہایت معقول ہے، دفتر بہت صاف ہے، کتب خانہ نہایت آراستہ ہے، کتب خانہ میں تقریباً چھ ہزار جلدیں ہیں، اکثر مطبوع کتابیں اور اکثر کتابوں کے نسخے

[1] اس موقعہ پر جو رقم لکھی ہوئی ہے، صاف نہیں چلتی، دو ہزار بھی پڑھی جا سکتی ہے، اور بیس ہزار بھی اس میزان کے ساتھ دو سو چونسٹھ روپے کی رقم صاف لکھی ہوئی ہے، یہ سالانہ خرچ ہوگا،

بہت زائد ہیں، مثلاً بخاری شریف کے نسخے ۳۰ سے زیادہ ہیں، کہ وقت ضرورت کے منگانے کی حاجت نہیں پڑتی،

امتحان افسوس ہے کہ میں ایسے وقت میں پہونچا کہ امتحان ہو رہا تھا، تدریس کا لطف حاصل نہیں کر سکا، لیکن حال امتحان کے پرچوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا، کہ طالب العلم اچھے مستعد ہیں اور مدرسہ کو دیکھ کر میں دیر تک کتب خانہ میں بیٹھا رہا، وہیں امتحان کے پرچے جانچے جاتے تھے، مولوی محمود حسن صاحب و مولوی خلیل احمد صاحب جانچ رہے تھے، وہاں سے اٹھکر حاجی محمد عابد صاحب کے پاس آیا، تھوڑی دیر بیٹھا رہا، اسی اثنا میں مولوی صاحب کا آدمی بلانے آیا، وہیں سے میں اور بھائی جی اٹھکر مولوی محمود حسن صاحب کے مکان پر آیا،

مولینا محمود حسن صاحب کے یہاں دعوت مولینا ذوالفقار علی صاحب اور اکثر بزرگان دیوبند بیٹھے ہوئے تھے مولینا ذوالفقار علی صاحب نے نہایت فراخدلی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اور صدر مقام میں باوجود ہم لوگوں کی معذرت کے بٹھایا، اس کے بعد فرمایا کہ جس وقت میں نے سنا کہ رائے بریلی سے کوئی صاحب آئے ہیں، تو میں سمجھ گیا تھا کہ صاحبزادے ہون گے، کیونکہ علم سے ان لوگوں کو ہمیشہ سے مناسبت ہے، پھر انھوں نے ایسی باتیں شروع کیں، جسکو سنکر شرم و ندامت سے ہمارے سر جھکے جاتے تھے، اور جتنے وہاں بیٹھے تھے، انھوں نے ایسا اظہار عقیدت کیا کہ ہم کو ان بزرگوں کے حسن ظن پر حیرت ہے، ہم لوگوں کی مخدومیت اور اپنی خادمیت کا اظہار ہر ہر بات پر فرماتے تھے، سب سے شکایت اس بات کی تھی، کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے، کیا آپ ہم کو اپنا خادم نہیں سمجھتے، یہ ہو ہی نہیں سکتا، کہ آپ سرائے میں رہیں، مولوی محمود حسن صاحب نے کہا کہ کل میں نے بہت اصرار کیا، لیکن انھوں نے مانا نہیں، مولینا ذوالفقار علی صاحب نے کہا کہ آپنے ان کے انکار کو تسلیم ہی کیوں کیا، آخر کو آدمی سرائے بھیجا گیا، اور اسباب

اٹھوا منگایا،

حافظ احمد صاحب کا اصرار اس عرصہ میں کھانا آیا نہایت اہتمام کیسا تھ کھانا پکوایا گیا تھا، کھانے کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب نے اپنے ہاتھ سے، اور مولوی محمود حسن صاحب نے بستر بچھا کر کہا، کہ آپ قیلولہ فرمائیں، ارادہ اسی وقت روانگی کا تھا، مگر حافظ احمد صاحب خلف الرشید مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ نے نہایت اصرار کیسا تھ شب کی دعوت کے نسبت فرمایا، ان کی استدعا ایسے تواضع و انکسار کیسا تھ تھی، کہ مجبوراً فسخ عزیمت کرنی پڑی،

اکابر دیوبند کا تواضع ان سب بزرگوں نے نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کیا، کہ آپ دو دن سے آئے ہوئے ہیں، بارش کی وجہ سے ہم لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی، ورنہ ہم سرائے میں حاضر ہوتے، اور آپنے باوجود اس بات کے جاننے کے، کہ دیوبند میں سب ہمارے خادم ہین، یہان فروکش ہونیسے گریز کیا، وہ یہ باتیں کر رہے تھے، اور ہم شرم و غیرت کے مارے عرق عرق ہوئے جاتے تھے، اے اللہ ان بزرگوں کا یہ حسن ظن اور ہماری یہ حالت، ان کی یہ حسن عقیدت اور ہماری یہ شامت اعمال، ان میں وہ مسکنت اور غربت، ہم میں یہ خودداری اور نخوت، ان میں وہ سادگی اور بےتکلفی، ہم میں یہ تکلف اور سیہ مستی، این الثریٰ من الثریا نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا،

اکابر کے پرکیف حالات اس کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرکے اوٹھے، اور نماز کو گئے، نماز کے بعد مولوی فضل الرحمٰن صاحب ملنے آئے، عصر تک وہ بیٹھے، حافظ احمد صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب بیٹھے رہے، بزرگان سلف یعنی خاندان عزیزیہ[1] و احمدیہ[2] کے تذکرے ہوتے رہے، یہ بزرگ حضرت سیدنا[2] کے قصص اس شگفتگی سے بیان کرتے تھے، جیسے عاشق اپنے معشوق کے حالات

[1] شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی [2] سید احمد صاحب بریلوی،

بیان کرتے وقت مزے لیتا ہے،

مولینا قاسم صاحب کا مزار

عصر کے بعد حضرت مولینا محمد قاسم صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے، شہر کے باہر کسی تکیہ میں ان کا مزار میدان میں کچا بنا ہوا ہے، اثناء راہ میں قاضی کی مسجد کی زیارت کی جسمیں حضرت سید صاحب فروکش ہوئے تھے،

مولینا ذوالفقار علی صاحب

وہان سے آکر مغرب کی نماز پڑھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب کے پاس بیٹھے رہے، ان سے علم ادب کا چرچا رہا، کچھ اپنے اشعار کچھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب و شاہ عبدالعزیز صاحب کے اشعار پڑھتے رہے، ان سے معلوم ہوا کہ مولوی مملوک العلی صاحب، مولینا رشید الدین خان[1] صاحب کے شاگرد تھے، اونھون نے بیان کیا، کہ شیخ احمد شروانی[2] نے شاہ صاحب سے ملنے کے پیشتر حدیقۃ الامزاج تصنیف کی تھی، اس میں جہان شاہ صاحب کا لامیہ نقل کیا ہے، دو اعتراض مرتبہ کے کئے ہیں، میں نے اسکی شکایت مفتی صدرالدین خان صاحب سے کی، مفتی صاحب نے فرمایا کہ شروانی بیچارہ شاہ صاحب کی قدر کیا جانے، مجھ سے مولینا رشید الدین خانصاحب بیان کرتے تھے، کہ جب شاہ صاحب معذور ہو گئے، اور امراض سخت میں گرفتار ہو گئے، تو مراق کی وجہ سے اکثر مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے، اسی درمیان میں بعض بعض لوگ سبق بھی پڑھا کرتے تھے چنانچہ میں مقامات حریری پڑھتا تھا، آگے آگے شاہ صاحب اور پیچھے پیچھے میں مقامات لئے ہوئے پڑھتا جاتا تھا، مقامات کی عبارت دو فقری ہے، میں ایک فقرہ پڑھتا تھا، دوسرا شاہ صاحب معاً پڑھ دیتے تھے، یا تو یہ فقرہ وہی ہوتا تھا، جو کتاب کا ہے، یا اونہی کا ہوتا تھا جو کتاب کے فقرہ سے زیادہ چست اور اچھا ہوتا تھا، یہ اوس وقت کا ذکر ہے، جب شاہ صاحب کو چودہ مرض

[1] شاگرد شاہ رفیع الدین صاحب ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی [2] شاہ عبدالعزیز صاحب کے معاصر ادیب و شاعر تھے یمن کے رہنے والے تھے، نفحۃ الیمن ابتدائی ادب میں ان کی مشہور کتاب ہے،

مہلک عارض ہو گئے تھے، کہ اگر ان مین سے ایک مرض بھی خدانخواستہ دوسرے کو لاحق ہو تو سلب حواس کے واسطے کافی ہے، مفتی صاحب یہ بھی فرماتے تھے، کہ ایک مرتبہ قصیدہ سننے سے ان کو رُویا ہو جاتا تھا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ سفر کلکتہ میں شاہ صاحب نے قاموس کا ایک نسخہ دیکھا تھا، مدتوں کے بعد نابینا ہو جانے پر وہ دہلی فروخت کے واسطے دست بدست شاہ صاحب کے مدرّ پہونچا، شاہ صاحب نے ہاتھ میں لیکر فرمایا کہ غالباً یہ وہ نسخہ ہے، جس کو میں نے دیکھا ہے پھر فرمایا کہ دیکھو فلاں صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت تو نہیں لکھی ہے، دیکھا گیا تو وہی تھی، آخر کو معلوم ہوا، کہ یہ وہی نسخہ ہے، مفتی صاحب کی یہ حالت تھی، کہ جب شاہ صاحب کا ذکر آجاتا، تو اس میں ایسے محو ہو جاتے کہ ان کے سب کاروبار چھوٹ جاتے تھے، مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کے نسبت فرماتے تھے کہ وہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھتے تھے۔ ایکبار مولینا محمد اسمٰعیل صاحب افق المبین[1] کا سبق پڑھ رہے تھے اور اسطور پر کہ دو دو چار چار ورق پڑھتے تھے، کہیں خود پوچھ لیتے تھے، کہیں شاہ صاحب بتا دیتے تھے، ورنہ یون ہی پڑھتے جاتے تھے، اس زمانہ میں مولوی فضل امام صاحب[2] خیرآبادی صدر امین ہو کر دہلی آئے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک دن وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، اور سبق ہو رہا تھا، وہ اس حیرت انگیز سبق کو دیکھ دیکھ کر متعجب ہو رہے تھے، اتفاقاً شاہ صاحب اثنائے سبق میں کسی ضرورت سے اوٹھے، تو انھوں نے کہا صاحبزادے کیوں مصنف کی روح کو تکلیف دیتے ہو، وہ بپاس ادب چپ ہو رہے، لیکن شاہ صاحب آگئے، اور انھوں نے سن لیا، فرمایا کہ مولوی صاحب اس لڑکے سے آپ کچھ پوچھئے، تو اس کا حال آپ کو معلوم ہو، پہلے تو مولوی فضل امام صاحب نے گریز کیا، لیکن آخر کو انھون نے ایک مسئلہ افق المبین کا پوچھا، مولینا محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کا نہایت شائستگی کے ساتھ جواب دیا، پھر انھوں نے اس کو رد کیا، پھر اونھوں نے جواب دیا، اس رد وقدح

[1] افق المبین میر باقر داماد کی فلسفہ کی انتہائی کتاب سمجھی جاتی ہے، [2] والد مولینا فضل حق خیرآبادی،

کی یہاں تک نوبت پہونچی، کہ مولوی صاحب مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کی پیچیدہ تقریر کا غور
کر کر کے جواب دینے لگے، اس وقت خاموش ہوئے،

ایک ولایتی طالب العلم صرف خیالی[۱] پڑھنے کی غرض سے ہندوستان آیا، یہان
آکر اوس نے پوچھا، کہ کون سب سے زیادہ ذہین و ذکی ہے، معلوم ہوا مولینا
محمد اسمٰعیل صاحب ہیں، ان کے پاس آیا، اور استدعا کی، اونھوں نے پیشتر فرصت نہ ہونے کا حیلہ
کیا، آخر الامر جب اوس نے زیادہ مجبور کیا، تو فرمایا کہ اچھا فرصت کے وقت، اوس نے بغل سے
نکال کر ایک کتاب دی، اونھوں نے پوچھا یہ کیا ہے، اوس نے کہا خیالی کا عبد الحکیم[۲] ہے، آپ
نے کہا یہ کیوں یہاں چھوڑے جاتے ہو، اوس نے کہا کہ بے عبد الحکیم کے خیالی حل نہیں ہوتی،
اس پر مولینا نے فرمایا کہ عبد الحکیم بیچارہ کیا ہے، جو میرے خیال میں باتیں آتی ہین، وہ عبد الحکیم
کے خیالوں سے بدرجہا بہتر ہیں، اوس نے کتاب تو اٹھالی، لیکن بہت ہی بد دل ہوا، کہ جب
ان کی یہ کیفیت ہے، کہ عبد الحکیم کو کچھ نہیں سمجھتے، تو خیالی خاک سمجھتے ہوں گے، لیکن چونکہ صرف
خیالی ہی کی غرض سے اس نے اتنی مسافت طے کی تھی، ٹھہر گیا، اور وقت مقررہ پر آیا، سبق جب
شروع ہوا تو اس کو معلوم ہوا، کہ واقعی ان کی نازک خیالیوں کے سامنے عبد الحکیم کوئی چیز
نہیں ہے،

خیر کثیر شاہ ولی اللہ صاحب کی بہت مشکل کتاب ہے، وہ مولینا محمد اسمٰعیل صاحب ایک زمانہ
میں پڑھاتے تھے، اور مطالعہ کر کے، ایک مرتبہ مطالعہ کر رہے تھے، کوئی مقام سمجھ میں نہیں آیا، دل
میں کہا کہ چلو چھوٹے چچا سے اس کو حل کریں، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی خدمت میں گئے، اور

[۱] علم کلام میں درس نظامی کی آخری کتابوں میں ہے، تصنیف ترک مصنف ملا خیالی، [۲] خیالی پر
ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا حاشیہ،

ان سے پوچھا تو انھوں نے اسکی بہت طویل تقریر کی، لیکن ان کا اشتباہ رفع نہیں ہوا، اس کے
بعد حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب ٹہل رہے تھے، پوچھا
کون ہے، انھون نے فرمایا اسمٰعیل، پوچھا کہ کیسے آئے، اونھون نے عرض کیا کہ میں خیر کثیر پڑھا
کرتا ہوں، ایک مقام میں شبہہ ہے چھوٹے چچا سے پوچھا، مگر تسکین نہیں ہوئی آپ سے تسکین کرنے
کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا، کہ یہ فلانا مقام ہوگا، اور میاں رفیع الدین
نے یہ تقریر اکی کی ہوگی، اونھوں نے کہا جی ہاں، فرمایا اس کا یہ مطلب ہے، دو چار جملے ایسے فرمائے
جس سے خیر کثیر کا بھی مطلب حل ہوگیا، اور شاہ رفیع الدین صاحب کی تقریر کا ما حصل معلوم ہوگیا

بیشتر حضرت مولینا عبد الحئی[۱] صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے، اور مولینا محمد اسمٰعیل صاحب
ان کے وعظ میں چپ چاپ بیٹھے رہا کرتے تھے، گویا یہ کچھ جانتے ہی نہیں، اتفاق سے مولوی
عبد الحئی صاحب بڑھانہ[۲] تشریف لے گئے، لوگون نے اصرار کیا تو ان کو منبر پر بٹھلا دیا، اونھون نے
جو وعظ شروع کیا، تو لوگوں کو یہ تمنا ہوگئی کہ مولوی عبد الحئی صاحب خدا کرے، دو چار ہفتہ نہ آئین

ایک مرتبہ مولینا اسمٰعیل صاحب وعظ کہنے بیٹھے ہی تھے، یہ اس زمانہ میں جبکہ سید[۳] صاحب کی
کفش برداری کر چکے تھے، ایک کمبخت آیا، اور اس نے مولوی صاحب کو گالیاں دینی شروع
کیں، حتی کہ اس نے کہا کہ تم ولد الحرام اور ولد الزنا ہو، مولوی صاحب نے فرمایا، اور نہایت
آہستگی سے فرمایا، میاں تم سے جس نے یہ کہا غلط کہا، میری ماں کے نکاح کے اب تک گواہ
موجود ہیں، یہ کہکر وعظ شروع کر دیا، ایک مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کہیں جا رہے تھے اور
اون کے ساتھ حکیم رستم علی بھی تھے، گو یہ بڑی شوقین داڑھی مونچھ چڑھی ہوئی رکھتے ہیں، لیکن
باوجود اس کے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھ ان کو شغف تھا، پیچھے پیچھے یہ بھی تھے، مولوی

[۱] مولینا شاہ عبد الحئی بڑھانوی المتوفی ۱۲۴۳ھ داماد مولانا شاہ عبد العزیز صاحب [۲] بڑھانہ انکا وطن تھا،
[۳] یعنی سید احمد بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہو چکے تھے،

محمد اسمٰعیل صاحب نے کچھ دور جاکر پیچھے دیکھا تو یہ نہ تھے، لوگوں سے فرمایا دیکھو رستم علی کہاں ہیں کہیں کسی سے لڑ نہ پڑے ہوں، لوگوں نے دیکھا تو واقعی ایک آدمی سے لڑ رہے تھے، سمجھا بجھا کر ان کو لائے، مولوی صاحب نے پوچھا تم کہاں رہ گئے تھے، کہنے لگے حضرت مجھ سے سنا جاتا ہے، ایک مردک آپ کو گالیاں دیتا تھا، مولوی صاحب نے فرمایا، بھائی اس کا قصور نہیں ہے، یہ ہمارے علماء کا قصور ہے، کیوں انھوں نے پہلے ہی سے وانشگاف بیان نہیں کیا، جس کے سننے سے اب ان کو وحشت ہوتی ہے،

ایک مرتبہ مولوی فضل[۱] حق صاحب کے سامنے کسی نے مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کو برا کہا، تو مولوی صاحب نے اس کو بہت زجر و تنبیہ کی، اور کہا کہ ہماری اون کی مخالفت ایسی نہیں ہے، کہ تم ایسے بازاری ان کو گالیاں دیں، مولوی ذوالفقار[۲] علی صاحب فرماتے تھے، کہ مولوی فضل امام صاحب و مولوی فضل حق صاحب باوجود عصبیت کے ناانصاف نہیں تھے، جب حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی، تو دیوبند کے بوڑھے بوڑھے لوگ استقبال کو نکلے، شہر کے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے، وہاں تک پہونچے، کہ سید صاحب نظر آئے، ایک تانگھن پر سوار تھے، اور دونوں طرف دو شخص رکاب تھامے ہوئے چلے آتے تھے، ان لوگوں نے آگے بڑھکر ملاقات کی، اس وقت ان دونوں بزرگوں کی ظاہری وضع و ہیئت سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا، کہ یہ کون ہیں، سید صاحب نے فرمایا کہ ان سے ملو، یہ مولینا محمد اسمٰعیل اور مولینا عبدالحیٔ ہیں،

سید صاحب جب نانوتہ[۳] تشریف لے گئے، تو پہلے سے میاں وجیہ الدین یعنی مولوی محمد قاسم صاحب کے خسر نے دعوت کا سامان کیا تھا، اونھوں نے یہ خیال کیا تھا کہ سید صاحب کے ساتھ بیس پچیس آدمی ہوں گے، انہی کے واسطے سامان کیا تھا، جب سید صاحب تشریف

[۱] مولوی فضل حق خیرآبادی [۲] مولوی ذوالفقار علی صاحب شیخ الہند کے والد بزرگوار،
[۳] نانوتہ سہارنپور جہاں مولینا محمد قاسم صاحب کا وطن تھا،

ے گئے، تو ان کے ساتھ جلال آباد کے پٹھانوں کا ایک گروہ تھا، میاں وجیہ الدین یہ دیکھ کر دنگ ہوگئے، انھوں نے خیال کیا کہ سامان تھوڑے آدمیوں کا کیا ہے، اور ان کے ساتھ ایک انبوہ ہے، کیونکر کافی ہوگا، خصوصاً اس وجہ سے اوران کو پریشانی ہوئی، کہ نانوتہ ایسا گاؤں ہے، جہاں دفعۃً زیادہ سامان کا فراہم ہونا بہت دشوار ہے، آخر شدہ شدہ یہ خبر سید صاحب کو پہونچی، سید صاحب نے ان کو بلا کر فرمایا کہ آپ گھبرائیے نہیں اپنی چادر دیدی، کہ اس کو کھانے پر ڈھانک دو اور اس کے نیچے سے نکال نکال کر صرف کرو، اونھوں نے ایسے ہی کیا، اور وہ کھانا سب کو کافی ہوگیا،

مولینا ذوالفقار علی صاحب فرماتے تھے، کہ سید صاحب اس نواح کے اکثر قصبہ جات میں تشریف لے گئے ہیں، لیکن جہاں جہاں تشریف لے گئے ہیں، وہاں اب تک خیر و برکت ہے، اور دو ایک گاؤں اور قصبہ ایسے ہیں، جہاں نہیں گئے، وہاں اب تک وہی نحوست اور شامت باقی ہے، چنانچہ منگلور میں نہیں گئے، وہاں کے لوگوں میں وہی جہالت اور قساوت ہے، اور ایک مختصر گاؤں ہے، جہاں مسلمانوں کے دو چار گھر ہیں، اتفاقاً سید صاحب کسی ضرورت سے وہاں بھی گئے ہیں، وہاں بھی خیر و برکت پائی جاتی ہے، گویا ایک نور مستطیل ہے، کہ جدھر وہ گئے، اودھر وہ پھیل گیا ہے،

اسی قسم کے بہت قصے مولینا نے فرمائے، جو اس روسیاہ کو یاد نہیں رہے، اتنے ہی میں مولوی احمد[۱] صاحب لالٹین لے کر آگئے، اور کہا کہ کھانا تیار ہے، غریب خانہ تک چلئے، وہاں جاکر کھانا کھایا، کھانے میں بڑا تکلف اور اہتمام کیا تھا، کھانے کے بعد پھر سید صاحب کا تذکرہ شروع ہوا، مولوی محمود حسن[۲] صاحب و مولوی حبیب[۳] الرحمن صاحب وغیرہ بھی شریک تھے، یہ لوگ ایسی شیفتگی سے بیان کر رہے تھے، جس کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی، ان بزرگوں نے بالاتفاق بیان کیا

[۱] مولوی حافظ احمد صاحب بن مولینا محمد قاسم صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند [۲] حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن صاحب [۳] مولینا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دوم دار العلوم دیوبند،

کہ مولینا محمد قاسم صاحب کو سید صاحب کیساتھ ایسی عقیدت تھی، کہ ان کے ادنی ادنی ہمراہیوں کے ساتھ وہ باادب پیش آتے تھے، اگر سید صاحب کے متعلقین میں سے کوئی شخص ملتا تھا، تو اس سے ایسا ملتے تھے، جیسا کوئی عقیدت مند مرید اپنے پیر و مرشد سے یا خادم اپنے آقا سے،

ایک شخص حاجی شفاعت خان سید صاحب کے قافلہ کے رامپور سے باہر عزلت نشین ہو چکے تھے، وہ کسی سے نہیں ملتے تھے، جب مولینا محمد قاسم صاحب کا تذکرہ مشہور ہوا تو انھوں نے ان کے نام ایک خط لکھا کہ میں نہایت ضعیف ہوں، کہیں آجا نہیں سکتا، لیکن آپ کے دیکھنے کو ایسا دل چاہتا ہے، کہ بے اختیار جی میں آتا ہے، ڈولی پر بیٹھ کر چلا آؤں، مگر چونکہ آپ سفر میں بھی رہتے ہیں، اسلئے اس خط کے ذریعہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کہاں ہیں، ٹھیک مقام سے اطلاع دیجئے،

مولینا محمد قاسم صاحب کو جب یہ خط پہونچا، تو ان کو بہت تشویش ہوئی، اونھوں نے کہا کہ من آنم کہ من دانم، معلوم نہیں کہ اس بزرگ سے میرا حال کس نے کس طور پر بیان کر دیا ہے، جس سے وہ میرے ملنے کے مشتاق ہوئے ہیں، ان کو لکھ دیا کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں، کہ آپ مجھ سے ملیں لیکن اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو میں خود حاضر ہونگا، جب مولینا صاحب شاہجہان پور[1] تشریف لے گئے، تو بعد فراغت کے وہاں سے رامپور بھی گئے، اور حاجی شفاعت خاں کے یہاں پہونچے، وہ گھر میں تھے، اطلاع ہوئی، فوراً نکل آئے، مگر بہت خوش ہوئے، آنکھوں سے معذور تھے، پوچھا کوئی ہے تو نہیں، مولوی صاحب نے کہا دو آدمی ہیں، مولوی احمد حسن صاحب[2] امروہی اور ایک اور شخص تھے، ان سے کہا تم باہر چلے جاؤ، جب وہ باہر نکلے تو کواڑ بند کر لئے، دو گھنٹہ اندر رہے معلوم نہیں کہ کیا معاملات ہوتے رہے، مولوی احمد حسن صاحب نقل کرتے تھے، کہ ہم نے کواڑوں میں بہت کان لگائے، مگر کچھ معلوم نہیں ہوا،

[1] شاید شاہجہان پور کے مشہور مناظرہ کے وقت [2] مولینا احمد حسن صاحب امروہوی مولینا قاسم صاحب کے شاگرد خاص،

سب نے بالاتفاق بیان کیا کہ سید صاحب کے اکثر دیکھنے والے بیان کرتے تھے، کہ مولوی قاسم صاحب خلقاً و خُلقاً مولینا محمد اسمٰعیل صاحب سے بہت مشابہ ہوئے ہیں، سید صاحب کے دیکھنے والوں نے انقراض صحبت کے بعد پھر کسی کا وعظ نہیں سُنا، البتہ اگر کبھی اتفاق ہوا، تو مولوی صاحب مرحوم کا وعظ سُنا کرتے تھے، اور کہتے تھے، کہ ان کا وعظ مولینا محمد اسمٰعیل صاحب کے وعظ سے بہت ملتا ہے، اس کے بعد کچھ حضرت سید صاحب کے غیبوبت[1] و ظہور کا ذکر ہوا، ان سب لوگوں نے اس بے بضاعت سے پوچھا، میں نے کہا کہ اس میں تو شک نہیں کہ سید صاحب نے اس قسم کی پیشین گوئیاں فرمائی تھیں لیکن وقوع میں اب تک اشتباہ ہے، مولوی محمود حسن صاحب نے فرمایا، یہی ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا مسلک ہے، پھر اونھوں نے نہایت معتبر ذریعہ سے یہ قصہ سنایا، اور سب حاضرین نے اس پر اتفاق کیا، حدثنا الشیخ الصالح محمود حسن والحافظ احمد بن مولینا محمد قاسم والمولوی حبیب الرحمن وکلھم ثقۃ قالوا حدثنا شیخنا الثقۃ الصدوق الحجۃ مولانا رشید احمد الگنگوھی حدثنا الشیخ الزاھد المتقی الاورع الحجۃ مولانا مظفر حسین الکاندھلوی قال سمعت من شیخنا و مولینا السید احمد عشرۃ امور وقعت منھا تسعۃ و لقیت واحدۃ وھو غیبوبتہ و ظھورہ رحمہ اللہ تعالیٰ واللہ اعلم، یعنی حضرت مولینا رشید احمد صاحب کی زبانی سنا وہ فرماتے تھے کہ ہم نے مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے سنا، وہ فرماتے تھے، کہ ہم نے سید صاحب کی زبان سے دس پیشینگوئیاں سنیں، تو ان میں سے واقع ہو چکی ہیں، اور ایک باقی ہے، وہ پیشین گوئی آپ کی غیبوبتہ اور ظہور کے بارہ میں ہے، یہ بھی مولوی مظفر حسین صاحب فرماتے تھے، کہ قبل اس واقعہ کے سید صاحب مبہم باتیں کیا کرتے تھے، اس قسم کی کہ بندہ کو مولیٰ کی رضامندی کا خیال رکھنا

[1] حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ (سرحد میں) جب سکھوں کا مقابلہ کیا، اور مجاہدین کو شکست ہوئی، اور مولینا اسمٰعیل شہید ہوئے اسوقت سید صاحب کے معتقدوں میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کا خیال تھا کہ سید صاحب شہید ہو گئے، دوسرے کا خیال تھا کہ وہ مخفی ہو گئے ہیں اور عنقریب انکا ظہور ہوگا،

چاہیئے، جیسا حکم ہو ویسا کرے، اگر کمل اوڑھنے کا حکم ہو تو کمل اوڑھ لے، اور اگر اور کچھ حکم ہو تو وہ کرے، میں نے کہا حضرت صاف صاف بیان کیجئے جو کچھ بیان کرنا مقصود ہے، لیکن سید صاحب نے اس سے گریز کرکے پھر تھوڑی دیر میں وہی کہنا شروع کیا،

مولوی ذوالفقار علی صاحب یہ بھی بیان کرتے تھے، کہ ان اطراف میں دیکھنے والوں نے یہانتک بیان کیا ہے کہ شب کے وقت سید صاحب چارپائی پر استراحت فرماتے تھے اور ایک جانب مولینا عبدالحیٔ صاحب دوسرے جانب مولینا محمد اسمٰعیل صاحب بیٹھکر صبح کر دیتے تھے، رات میں جس وقت سید صاحب کی آنکھ کھلتی تھی، فرماتے تھے، مولینا وہ کہتے تھے، حضرت آپ کہتے تھے فرمائیے، ان کو جو پوچھنا ہوتا تھا، وہ پوچھتے تھے، سید صاحب مختصر الفاظ میں جواب دیتے پھر سو رہتے اور یہ دونوں بزرگ اس جواب کے مزہ لیا کرتے، اور اس کے وجد و محویت میں رہتے، پھر جب آنکھ کھلتی، پھر کچھ پوچھتے، یہ بھی کہتے تھے، کہ دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں تکبیر اولی سید صاحب سے فوت ہوگئی تھی، اس دن مولینا عبدالحیٔ صاحب نے اسی کا وعظ فرمایا تھا، یہ بھی فرماتے تھے، اور اکثر علماے دیوبند نے بالاتفاق بیان کیا، کہ یہ مدرسہ سید صاحب کی پیشینگوئی کے موافق بنا ہے، جب وہ یہاں تشریف لائے تھے، تو فرمایا تھا، کہ مجھ کو اس قصبہ سے علم کی شعاعین یا انوار نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ جب یہ مدرسہ اول اول کھلا ہے، قاضی کی مسجد کے پاس کھولا گیا ہے، جہاں سید صاحب رونق افروز ہوئے تھے، پھر اوس کے بعد دوسری جگہ منتقل ہوا، اور اب جہاں ہے، اس کی نسبت حضرت مجدد صاحب نے پیشینگوئی کی تھی، ایک مرتبہ اس جگہ ان کا گذر ہوا تھا، فرمایا کہ مجھ کو یہاں علم کے انوار نظر آتے ہیں، دیر تک وہاں اسی قسم کی باتیں رہیں، اوس کے بعد پھر قیام گاہ پر آئے، عشا کی نماز پڑھ کر سب رخصت ہوئے اور ہم سو رہے،

روز یک شنبہ ہفتم شعبان، صبح کو اٹھکر چلنے کا سامان کیا، مولوی محمود حسن صاحب چونکہ ہفتہ کے دن دوسرے وقت ہمارے پاس بیٹھے رہے، امتحان میں نہیں گئے، اس وجہ سے آج ذرا جلد رخصت ہوکر مدرسہ چلے گئے، اور مولینا ذوالفقار علی صاحب سے بھی رخصت ہوئے مولوی حافظ احمد صاحب و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب وغیرہ مشایعت کی غرض سے ہمراہ ہوئے، ہم نے بہت معذرت کی، لیکن انھوں نے نہ مانا، چونگی کی چوکی تک آئے، اور چلتے چلتے وعدہ کرالیا کہ پھر دیوبند واپسی کے وقت آنا، کیونکہ بارش کی وجہ سے و نیز امتحان کی جہت سے لوگوں کو ملنے کی مہلت نہیں ملی، اور بات چیت کرنے کا لطف حاصل نہیں ہوا، اس قدر مبالغہ اور اصرار کے ساتھ اونھوں نے استدعا کی، کہ ہم نے منظور کیا، انشاء اللہ تعالیٰ کے لفظ کیساتھ اگر موقع ملا، تو گنگوہ سے واپسی کے وقت ایک دن کے لئے دیوبند اوتر پڑونگا، بھائی جی نے چھ روپیہ سالانہ چندہ مقررہ کیا، اور اس بے بضاعت نے بسبب کم مائگی ایک روپیہ اور ایک روپیہ برادر صاحب مخدوم مکرم مولینا سید ابوالقاسم[۱] صاحب کی طرف سے ہر چند کہ ان کی جانب سے زیادہ چندہ دینے کی گنجایش تھی، مگر بے اجازت ان کے میں نے زیادہ چندہ کہنے کی جرأت نہیں کی، وہان سے روانہ ہوکر اسٹیشن آئے، اور رڑکی کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوگئے، اارنی کس محصول پڑا، ۸ بجے سہارنپور پہونچے، گاڑی کے آنے میں دیر تھی کھانا کھایا، اور بیٹھے رہے، دو بجے وہان نماز پڑھ کر روانہ ہوئے، چار بجے رڑکی پہونچے، سرا میں آکر ٹھہرے،

رڑکی رڑکی اسٹیشن سے بہت دور ہے، مگر نہایت آباد اور پر رونق شہر ہے، چھاونی اور گودام اور کالج یہاں کے مشہور مقام ہیں، رڑکی مدرسۂ حرب ہے، سفر مینا کی دو پلٹنیں اور چار توپخانے یہاں رہتے ہین، ایک کے بعد دوسرے کی بدلی ہوتی رہتی ہے، جب وہ کام سیکھ لیتے ہین، تو دوسرے

[۱] مولینا سید ابوالقاسم صاحب ہسوی،

آتے ہیں، حافظ نور اللہ صاحب ایک کارخانہ دار ہین، اون سے دہلی میں بھائی جی سے ملاقات ہوئی
تھی، جب اونھوں نے ان کے آنے کی خبر سنی تو فوراً سرائے میں آئے اور بمبالغہ واصرار اسباب اٹھوا
لے گئے، اور بہت دھوم دھام کے ساتھ دعوت کا سامان کیا، رات بھر وہیں آسایش کیساتھ رہے،
رڑکی کالج
روز دوشنبہ، ہشتم شعبان، صبح کو اٹھکر حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر کھانا کھایا، کھانا
کھانے کے بعد کالج دیکھنے کو گئے، عجیب وغریب عمارت ہے، اور اس سے قطع نظر اوس کے طرز
تعلیم میں عملی تربیت مشروط ہے، اس کے متعدد درجے ہیں، اور دونوں طرف کمروں میں بانی کالج
مسٹر طامسن کی تصویر سنگی یادگار کے طور پر نصب ہے، بڑے کلاس، اس میں دو ہیں، ایک اپر کلاس،
دوسرا لوور کلاس اور ہر ایک میں دو دو درجے ہیں، اپر کلاس میں پہلا درجہ انجینیری کا ہے، اور دوسرا
اورسیری کا، امیدوار کیلئے امتحانِ داخلہ مقرر ہے، کسی مدرسہ یا کالج کا سارٹیفکٹ یہاں بکار آمد
نہیں ہے، امتحان داخلہ بہت سخت ہے، اس میں کامیاب ہونے کے بعد امیدوار کالج میں داخل
کر لیا جاتا ہے، بشرطیکہ تعداد معین سے زیادہ امیدوار نہ ہوں، ورنہ بعد کامیابی امتحان کے بھی داخل
نہیں ہو سکتا، پھر سال آیندہ میں امتحان کی ضرورت ہے، وہ امتحان بکار آمد نہیں ہوتا، داخل ہونے
کے دو برس کے بعد اگر کسی کلاس میں کامیاب ہو گیا، تو اس کو جگہ ملتی ہے، ورنہ وہ مدرسہ سے
نکال دیا جاتا ہے، پھر وہ امتحان نہیں دیسکتا، اٹھارہ سے بائیس سال تک کی عمر مشروط ہے،
اور دس سے پچاس روپیہ تک اسکالرشپ ملتی ہے، مدرسہ کے گرد طلبہ کے رہنے کے لئے بورڈنگ
ہاؤس اور افسروں کے لئے کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں، ماسٹر اکثر ہندوستانی اور انگریز ہیں کئی ماسٹر مسلمان ہیں اور
طلبہ اکثر مسلمان ہیں[1] ہندو اور انگریز بھی ہیں، پنجابی زیادہ ہیں، مدرسہ کے متعلق پریس کا بھی کارخانہ ہے،
اس میں نقشے اور مدرسہ کے زیادہ تر کاغذات چھپتے ہیں، ٹائپ کے پریس بہت اچھے ہیں، ہر رنگ

[1] یہ اس وقت کا حال تھا، اب کیا ہے؟

کے کاغذات چھپتے ہیں، پتھر کے پریس بھی ہیں، لیکن کوئی کاتب خوش نویس نہیں ہے، اوسکو ہم نے
اچھے طور پر دیکھا، اس کے بعد کمروں میں گئے، جس میں حروف جوڑے جاتے ہیں، یا دستی نقشہ کشی
و تصویر کشی ہوتی ہے، بڑے بڑے دستکار لوگ ہیں، اس میں ان کو بڑی مہارت ہے، کالج
کے ہر ہر کمرہ میں جاکر اچھی طور پر اس کو دیکھا، ہندوستان کی نامور عمارتوں کے نقشے دیواروں
پر آویزاں تھے، ان کی خوب سیر کی، اوس کے بعد حافظ نور اللہ صاحب کارخانہ دار کے مکان پر آئے
پیران کلیر
ظہر کی نماز پڑھ کر پیران کلیر دیکھنے کو روانہ ہوئے، یہاں سے پیران کلیر تین میل ہے نہر
گنگ جو ہردوار سے نکلی ہے، اور کانپور میں آکر گری ہے، وہ اسی شہر میں ہو کر گئی ہے، اور پیران کلیر
بھی اس کے کنارے ہے، پیران کلیر کے قریب تک نہر کے دونوں جانب زینے اور دیوار نہایت
عمدہ بنی ہے، از زینہ زینہ میں پیادہ پا روانہ ہوا، نہر کے کنارے کنارہ جانے میں عجیب لطف تھا،
جس کو زبان و قلم ادا نہیں کر سکتے، رڑکی سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک عجیب ودلچسپ جگہ ہے
وہ یہ کہ نہر شمال سے جنوب کو آئی ہے، اور چونکہ اس کا منبع یہاں سے بہت قریب ہے اس
واسطے اس کی جگہ بہت عریض ہے، اس کا عرض گومتی سے زیادہ ہی ہے، کم نہیں ہے، اور ایک
دریا مغرب سے مشرق کو بہتا ہوا اس جگہ متقاطع ہوا ہے، اس کی صورت یہ نکالی ہے، کہ دریا
کا پل بہت بڑا جو پندرہ کوٹھیوں کا ہے، باندھا ہے، اس کے اوپر نہر کا عبور ہوا ہے، اس پل پر بیچ
میں نہر جاری ہے، اور اس کے دونوں جانب سڑکیں ہیں، جن پر گھی اچھے طور عبور کر سکتی ہے اب
آپ اس پل کے عرض و طول کی وسعت کو خیال کر سکتے ہیں، اور یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں، کہ پل کس
قدر مستحکم بنایا گیا ہے، جس پر گومتی سا بڑا دریا زور شور سے بہتا ہے، اور اس کے دور دیہ آمد و رفت
ہوتی ہے، اللہ اللہ خدا نے انسان ضعیف البنیان کو کیا قدرت عطا فرمائی ہے، بقول احمد ؎
اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں   سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں،

اس کی خوب سیر کرکے آگے بڑھا، راستہ میں کئی پل ملے، ان پر سے عبور کرتا ہوا پیران کلیر کے قریب پہنچا، داہنے جانب نہر کے پیران کلیر کی بستی ہے، اس میں ایک بہت بڑی درگاہ ہے، اور اس کے محاذی دوسرے جانب غیر آباد جگہ میں دوسری درگاہ ہے، یہ درگاہ اس درگاہ سے عمارت کی حیثیت سے بہت خوش منظر ہے، اس درگاہ میں جاکر فقیر فاتحہ و ایصال ثواب سے مشرف ہوا، اس کے بعد وہاں سے واپس آیا، عشا کے قریب گھر پہنچا،

فقیر نے فی زعمہ یہ سمجھا تھا، کہ جہاں اس نے فاتحہ پڑھا ہے، وہ درگاہ حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا، کہ یہ درگاہ حضرت صابر علی کی ہے، اور حضرت علاء الدین کی درگاہ بستی میں ہے، جہاں یہ فقیر بسبب ماندگی کے حاضر نہیں ہو سکا، اور حضرت صابر علی حضرت علاء الدین کے بھانجے ہیں، مجھ کو اس بات کے سننے سے بہت افسوس ہوا، گو کہ اس بات پر پورا اطمینان نہیں ہوا، لیکن زیادہ تر اس بات پر افسوس ہوا کہ میں دونوں جگہ کیوں حاضر نہیں ہوا، اب اسکی تلافی یوں ہی ہو سکتی ہے، کہ دوبارہ حاضر ہوں، اور لطف یہ ہے، کہ چونکہ فی زعمی میں اوس درگاہ کو حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سمجھتا تھا، اس واسطے وقت ایصال ثواب اور جمعیت قلب کے اونہی کا نام لیا تھا، اور ان ہی کی طرف توجہ تھی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال شب کو میں با آسائش تمام کارخانہ دار صاحب کے یہاں رہا،

سہارنپور روز سہ شنبہ نہم شعبان صبح کو ارادہ روانگی کا تھا، مگر بھائی جی جس غرض سے یہاں تک آئے، وہ اب تک حاصل نہیں ہوئی تھی، اس واسطے فسخ عزیمت کی گئی، اور دوسرے وقت پانچ بجے وہاں سے سہارنپور روانہ ہوئے، بعد مغرب کے سہارنپور پہونچے، دہاں سے سیدھے محلہ چوک میں ملا عنایت اللہ خان صاحب کے مکان پر آئے، یہ بزرگ مولینا محمد قاسم صاحب کے مرید و حضرات تکیہ

ل مقصود تکیہ شاہ علم اللہ صاحب رائے بریلی ہے جہاں حضرت سید صاحب شہید کا وطن تھا،

کے بہت بڑے معتقد ہیں، خاص سہارنپور کے رہنے والے ہیں، اور مدت تک رائے بریلی میں تھانہ دار رہ چکے ہیں، ہمیشہ بالالتزام جمعہ کی نماز تکیہ میں پڑھتے تھے، بہت بڑے صالح اور نیک بخت ہیں کبھی رشوت نہیں لی، اور کسی قسم کی اپنے دانست میں بددیانتی نہیں کی، رات بھر یہیں رہنے کا قصد ہے، صبح کو ارادہ ہے، کہ اگر سواری کا انتظام ہوگیا، تو بشرط خیریت انشاء اللہ تعالیٰ گنگوہ روانہ ہونگے، اور بعد واپسی کے یہاں کے مدارس دیکھیں گے،

روز چہارشنبہ دہم شعبان، آج ارادہ روانگی تھا، مگر افسوس ہے کہ دس بجے گئے ہیں، اور اب تک گاڑی نہیں ملی، اسی وجہ سے ارادہ آج کا فسخ کیا گیا، ۱۱ بجے کھانا کھایا، اس کے بعد جامع مسجد کی سیر کو چلے، اور یہ بھی قصد تھا کہ حافظ قمر الدین صاحب جو پیش امام ہیں، اون سے ملئے، ان کی بڑی تعریف مولوی عبد الحی صاحب نے دہلی میں فرمائی تھی، جامع مسجد گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ اس بے بضاعت سے ملنے گئے ہیں، ان کے انتظار میں وہاں ٹھہر گیا تھا، یہاں تک کہ ظہر کے وقت وہ آگئے نماز کے بعد اون سے ملاقات ہوئی، بڑے خلق و مروت سے پیش آئے، اسی اثنا میں مولوی احمد علی[1] صاحب تشریف لائے، اور اس خبر کے سننے سے کہ یہ روسیاہ حضرت سیدنا کے خاندان کا بدنام کنندہ ہے، نہایت خلوص و ارادت سے ملے، اور بہت دیر تک بیٹھے رہے، ان سے معلوم ہوا کہ حضرت سید صاحب کے خلفا میں ایک بزرگ گمہرہ ضلع مظفر نگر میں اب تک بقید حیات ہیں، اور ان کے مریدوں میں بھی ایک شخص سہارنپور میں موجود ہیں، وہاں سے اٹھکر خاکسار مدرسہ مظاہر العلوم کی سیر کو گیا، امتحان کی وجہ سے مدرسہ آج کل بند ہے، مکان اور کتب خانہ سرسری نگاہ سے دیکھکر وہاں سے قیام گاہ پر واپس آیا،

مولوی حبیب الرحمن صاحب سہارنپوری عصر کی نماز پڑھکر مولوی حبیب الرحمن صاحب خلف

[1] مولینا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری محشی صحیح بخاری،

مولینا احمد علی صاحب مرحوم سے ملنے کو ان کے مکان پر گیا، مردانہ مکان میں تھے، میں وہاں جو گیا
تو وہ خود کمرہ سے برآمد ہو کر باہر ہی بیٹھے، کمرہ میں چقیں پڑی ہوئی تھیں، کچھ لوگ اندر تھے، وہ بھی پیشتر اندر
بیٹھے تھے، مجھ کو حیرت ہوئی، کہ یہ باہر کیوں بیٹھے، لیکن یہ حیرت جلد تر زائل ہو گئی، جب یہ معلوم ہوا کہ اندر
لوگ شطرنج کھیل رہے تھے، اس کے بعد مولوی صاحب نے پان کی تواضع کی، اور مجھ سے کل کے قیام
کی نسبت کہا، لیکن میں نے معذرت کی، کہ مجھکو گنگوہ بہت جلد جانا ہے، اس کے بعد مولوی صاحب
نے رفع دخل کے طور پر کہا، کہ یہ میرا مکان نہیں ہے، میرے چھوٹے بھائی کا ہے، میرا مکان دوسرا
ہے اسی وقت میں مدرسہ سے آیا ہوں، ابھی ابھی یہاں آگیا، میں نے پوچھا کہ آج کل آپ کیا کیا
پڑھاتے ہیں، فرمایا کہ چار برس سے اہل شہر کے اصرار سے میں نے مظاہر العلوم میں تعلق کر لیا ہے،
اب آج کل صحاح ستہ و توضیح تلویح و ہدایہ و بیضاوی وغیرہ پڑھاتا ہوں، مولوی صاحب صورت
شکل کے بہت وجیہ قد و قامت میں درست مہذب متین خوش پوشاک اور شوقین ہیں، پانچ چھ
روپیہ کا ایک پنجابی جوتہ پہنے ہوئے گھڑی ہاتھ میں باندھے ہوئے پان رکھنے کی تین تین ڈبیاں
جیب میں ایک جرمن سلور کی جس میں پان، دوسری ربڑ کی جس میں چھالیا ہے، تیسری بلور کی یا کسی
اور پتھر کی، جس میں بنارس کی بسی ہوئی تمباکو کی گولیاں رکھی ہیں، تھوڑی دیر بیٹھکر میں اٹھ آیا،

مولینا محمد حسین

قیام گاہ پر آیا ہی تھا، کہ مولوی نظام الدین ملنے آئے، یہی صاحب بگھرہ کے مولینا
کے مرید ہیں، ان سے مفصل حال معلوم ہوا، انھوں نے بیان کیا، کہ ان کا نام حضرت مولینا محمد حسین ہے،
ایک سو گیارہ برس کی ان کی عمر ہے، بدن مرتعش ہو گیا ہے، نگینہ اور بجنور اور نجیب آباد میں ان کا بہت
رشد ہے، سید صاحب کے خلفا میں ہیں، اور حضرت سیدنا کے ظہور کے منتظر ہیں، اکثر اپنے مریدوں کے
یہاں چلے جاتے ہیں، چنانچہ آج کل بھی شاید اسی طرف گئے ہوئے ہیں، میں نے کہا کہ ایک خط
لکھکر دریافت کر دیجئے، جواب دیا انشاء اللہ تعالیٰ گنگوہ سے واپس آنے پر مل جائے گا، انھوں

نے کہا کہ آج ہی میں لکھ دوں گا، یہ عشاء تک میرے پاس بیٹھے رہے، ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سید
صاحب ابو بنی کی مسجد میں مقیم ہوئے تھے، جب سہارنپور تشریف لائے تھے، چونکہ رات کا وقت
ہے، اس وجہ سے میں اس مسجد کی زیارت کو نہیں جا سکا، بعد واپسی کے ارادہ ہے، گاڑی ہو گئی
ہے تین روپیہ کرایہ اور ایک روپیہ خوراک جملہ چار روپیہ آمد و رفت کے لئے کل علی الصباح روانگی کا
ارادہ ہے، انشاء اللہ تعالیٰ بشرط عدم موانع،

سید صاحب کے چند اور مرید

مولوی نظام الدین نے بیان کیا، کہ حضرت امیر المومنین کے مریدوں میں
سہارنپور کے رہنے والے حکیم مغیث الدین صاحب تھے، ان کا انتقال ہو گیا، ان کے صاحبزادے
حکیم مشتاق احمد صاحب ہیں، ان کو آپ کے آنے کی اطلاع نہیں ہے، ورنہ حاضر ہوتے، فرمایئے
تو اطلاع کر دوں، میں نے کہا کہ میں علی الصباح روانہ ہونے کو ہوں، اور یہ شب کا وقت ہے
ان کو آنے میں تکلیف ہو گی، بعد واپسی کے انشاء اللہ تعالیٰ میں ان سے خود ملوں گا، ایک حضرت
سیدنا کے مریدوں میں اور سُنے گئے، جست بیچا کرتے ہیں، میرا ارادہ خود ان کے پاس جانے کا تھا
مگر حافظ قمر الدین صاحب خود ان کو بلا لائے، یہ بھی بہت معمر ہیں، صغر سنی میں حضرت امیر المومنین
کی اونھوں نے زیارت کی ہے، دیر تک بیٹھے رہے،

(باقی)

بقائے انسانی

کے

خلاف دو مفروضہ اعتراضوں کا جواب

از

جناب خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج گجرات پنجاب

ولیم جیمز امریکہ کا مشہور نفسی اور مفکر گذرا ہے، ۱۸۹۸ء میں اوس نے ہارورڈ یونیورسٹی میں یہ لکچر وقف انگرسول کے سلسلے میں دیا تھا، اسی سال یہ لکچر چھپ گیا، اوراس کے بعد کئی بار چھپا، میں نے ۱۹۱۷ء کی اڈیشن سے یہ ترجمہ کیا ہے، مصنف نے لکچر کے ساتھ جو نوٹ لکھے تھے، ان کا ترجمہ میں نے ضروری نہیں سمجھا، ان کے علاوہ چند نوٹ جو نفس مضمون سمجھنے میں معاون ہوں، شامل کر دئے ہیں، ولیم جیمز کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا یہ شخص ان مفکروں میں تھا جن کی تصانیف میں سائنس، فلسفہ اور ادبیات کا نہایت اچھا اتصال ہوا ہے،

"مترجم"

تاریخ کی ورق گردانی کیجئے، تو یہ افسوسناک حقیقت آپکے سامنے آئے گی، کہ جب نوع انسان کی کوئی اشد اور زندہ ضرورت رسمی طور پر کسی ادارہ کی صورت میں مرتب اور محفوظ ہو جاتی ہے تو ایک کام جو وہ ادارہ کرنا شروع کر دیتا ہے، یہ ہوتا ہے، کہ خود اس "ضرورت" کی فطری

تشفی میں وہ حائل ہو جاتا ہے، یہ منظر اس قدر عام ہے کہ ہمیں اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، قوانین اور عدالتوں میں کلیسائیات میں فنون لطیفہ کی انجمنوں میں طب[1] اور دوسرے پیشوں میں خود یونیورسٹیوں میں، غرض ہر جگہ ہمیں اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے،

یہ بات کس قدر عام اور کتنی افسوسناک ہے کہ ان انجمنوں اور اداروں کے کارکن خود ان روحانی مقاصد کی شکست میں مصروف نظر آتے ہیں، جن مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کا ادارہ یا ان کی انجمن معرض وجود میں آئی تھی، اُن کی فنی اصطلاحی روشنی (اور اس روشنی کے سوا کوئی دوسری روشنی انکی نظر میں نہیں آتی) انھیں اندھیرے میں ڈال دیتی ہے، اور ان کی تنگ نظری انکی پیشوا بنتی ہے، اور انھیں ان کے مجوزہ روحانی مقاصد کی خدمت سے ہٹا دیتی ہے،

گذشتہ موسم بہار میں جب مجھے ہماری یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کی طرف سے اس انگرسول لکچر کی دعوت ملی، تو معاً یہ خیال میرے دل میں آیا، کہ خواہش بقا انسان کی اہم روحانی ضروریات میں سے ایک ہے، کلیساؤں نے اپنے آپ کو اس ضرورت کا امانت دار قرار دے رکھا ہے اس اجارہ داری کا نتیجہ یہ ہوا ہے، کہ بعض کلیسا اپنے رسمی اور مذہبی شعائر کی روشنی میں ایک شخص کو تو نہایت مہربانی سے یہ "بقا" عنایت فرما دیتے ہیں، اور دوسرے شخص کو محرومی محض کا فتوی دے دیتے ہیں، اور اگر اُسے بقا عطا کرتے بھی ہیں، تو صرف ایسی صورت میں کہ اُسے ایسی بقا کی خواہش ہی نہ رہے، اب اس انگرسول لکچر ہی کو لیجئے، غالباً وقف انگرسول کے بلند خیال بانی

---

[1] مثلاً علم طب کا یہ کام ہے کہ بیماریوں کے علاج تجویز کرے، لیکن ہم دیکھتے ہیں، کہ علم طب کے مختلف فرقے، مثلاً یونانی، ویدک، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، جراحی، وغیرہ ایک دوسرے کے اس قدر مخالف ہیں، کہ اگر ایک فرقہ نے کسی اچھے علاج کا انکشاف کیا ہے، تو دوسرے اسکے خلاف رہی بینگے محض اس وجہ سے کہ یہ علاج ان کے اپنے فرقہ کا تجویز کردہ نہیں ہے، (مترجم)

کی خواہش یہ تھی کہ ہماری یونیورسٹی اس مقصد کو جو ہر وقت ان کے پیش نظر تھا، کلیساؤں سے بہتر طریقہ پر اور زیادہ فراخ دلی سے پورا کرے، کیونکہ یونیورسٹی ایک ادارہ ہے جسکے لئے نہ تو روایات سلاسل بنی چاہئیں، اور نہ لکچراروں کے انتخاب میں ناممکنات اس کے لئے موانع بننے چاہئیں لیکن آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، کہ اس یونیورسٹی نے ایک ایسا شخص اس لکچر کے لئے آپکے سامنے لاکھڑا کر دیا ہے، جو یونیورسٹی کے کارکنوں میں تو ضرور شامل ہے[1] لیکن اس کے لئے ہرگز مشہور نہیں ہے کہ وہ بقاے انسانی کا ایسا پُرجوش پیغامبر ہے کہ جب تک وہ اس خوشخبری کو اپنے ہمعصروں تک نہ پہنچادے، اُسے چین ہی نہ آئے گا،

ان خیالات نے مجھے مجبور کرنا شروع کیا کہ اس تقریر سے انکار کر دوں، مسئلۂ بقاے روح کا انحصار تمامتر انسان کی اپنی ذاتی خواہش اور حس پر ہے، مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ نہ تو میرے اندر بقا کی خواہش ہی غیر معمولی طور پر تیز ہے، اور نہ اس مسئلہ کے متعلق میرا اشتیاق اس قدر زیادہ ہے، کہ اسے حل کیے بغیر مجھے نیند نہ آئے، اس وقت دنیا میں ایسے افراد موجود ہیں جن کا اشتیاق اس مسئلہ کے متعلق مجھ سے بہت زیادہ ہے، ایسے مرد اور ایسی عورتیں موجود ہیں جن کے دل میں بقا کی آرزو کی شدت جنون کے درجہ تک پہونچ چکی ہے، اشتیاق کی شدت نے ایسے اشخاص کے وجدان کو اس قدر باریک بیں بنا دیا ہے، کہ اس مسئلہ کے وہ پہلو جو میرے جیسے کم اشتیاق لوگوں کی نظر میں آتے ہی نہیں، ان کے لئے نمایاں حقیقت بنے ہوئے ہیں، بعض ایسے اشخاص سے میرا تعارف بھی ہے، جو یونیورسٹی کے کارکن نہیں، وہ فقیہوں کی زبان نہیں بولتے، بلکہ اہل خانہ کی جیسی زبان بولتے ہیں، سچ پوچھئے، تو آج کل کے زمانہ میں اگر کہیں اسکی ضرورت ہے کہ کوئی

[1] ولیم جیمز ہارورڈ یونیورسٹی میں پہلے نفسیات کا اور پھر فلسفہ کا پروفیسر تھا،

(مترجم)

پوستین پوش نبی، کسی مجمع میں آکر لوگوں کو الہام و البقا کی تعلیم سے اطمینان قلب بخشے، تو وہ موقع آج ہے، اور یہاں ہے، میری منصب داری نے خاصان حق کو کیوں اپنے حق سے محروم کر دیا!

لیکن ان خیالات اور اپنی منصب داری اور نااہلی کے باوجود میں آج آپ صاحبوں کے سامنے کھڑا ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ آیندہ پوستین پوش نبی بھی، یا استعارہ چھوڑ کر صاف الفاظ میں ایسے عام اشخاص بھی اس انگرسول کے لئے بلوائے جائیں گے جنھیں اپنے جذبات سے القا ہوتا ہے اسی طرح مجھے یہ امید بھی ہے، کہ اس وقف کے منتظمین میرے جیسے اور مختلف شعبوں کے منصبداروں کی باری بھی مقرر کریں گے، اور مزید غور و خوض کے بعد اس بات سے نہ ڈریں گے، کہ مجھ ایسا پیشہ ور نفسی غالبًا اپنے خیالات کے اظہار میں، سخت بے حس اور سلبی ثابت ہو گا، بات یہ ہے، کہ یہ مضمون نہایت وسیع ہے، مثلاً الگر صاحب[1] نے اپنی کتاب "نظریۂ حیات بعد الموت کی ناقدانہ تاریخ" کے اخیر میں پانچہزار سے زیادہ کتابوں کے نام گنائے ہیں، جن میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی ہے، یا اس کا ذکر موجود ہے، ہماری یونیورسٹی کی مجلس کو صرف ایک ہی لکچر کا خیال نہ رکھنا چاہئے، ان تمام لکچروں کا خیال بھی ضروری ہے، جو آیندہ سلسلہ وار اس موضوع پر ہوں گے، ایک لکچر خواہ وہ کتنا ہی الہامی جذبات سے پر ہو کافی نہیں ہو سکتا، مختلف لکچر ایک دوسرے کے نقائص اور خامیوں کو دور کریں گے، اور اس طرح ان لکچروں کے سلسلہ سے نوشتوں کا ایسا جامع ذخیرہ ہاتھ آئیگا، جو اس عظیم الشان موضوع کے شایان شان ہو گا، مجھے یقین ہے کہ بانی وقف کے دل میں یہ خیال موجود تھا، ان کی خواہش تھی، کہ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے تاکہ سب کے نتائج مل کر ایک خاص، موزوں اور صحیح رجحان کی صورت میں ظاہر ہوں، اگر صحیح نظر سے

[1] Critical History of the Doctrine OF A FUTURE LIFE BY ALGER

دیکھا جائے، تو وقف انگرسول کا سب سے ضروری کام یہ ہے کہ تقسیم کار باریک بینی سے کیجائے، اور فصیح البیان مقرروں، روحانیت کے پیامبروں اور مجھ ایسے تنگ نظر مگر باریک بین مخصصین اور ہر طرح کے لوگوں کو ان لکچروں کا موقع ملنا چاہئے، ان کے علاوہ ہر فرقہ کے الہیین انسانیات اور مابعد الطبیعیات کے مفکرین نفسین طبعیین، حیاتیین، اور علم الارواح کے سُراغ رسانوں، بلکہ ریاضی دانوں کو بھی بلانا چاہئے، اگر ان مختلف مفکرین میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنے نقطہ نظر سے سچائی کا ایک ایسا ذرہ بھی پیش کردے، جو دوسرے ایسے ذرات سے (جو دوسرے مفکروں کی تحقیقات سے منتج ہوں گے) ملحق اور متفق ہو جائے، تو ایسا مفکر اپنے تقرر کو صحیح ثابت کریگا

اس ایک گھنٹہ میں جو مجھے ملا ہے، میں کوشش کروں گا، کہ اپنے تقرر کو صحیح ثابت کروں میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دو ایسی باتیں، یا سچائی کے دو ایسے ذرّے پیش کروں گا، جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ میرے بعد جو مقرر بھی آئے گا، اسی کے خیالات سے میرے ان ذرات کا صحیح الحاق ہو جائے گا،

یہ دو باتیں جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں، درحقیقت جواب ہیں دو اعتراضات کے، یہ دو اعتراض کیا ہیں،؟ یہ دو رکاوٹیں ہیں، جو ہماری موجودہ تہذیب کے حیات بعد الموت کے تصور میں باقی ہے، ان ذہنی رکاوٹوں کی وجہ سے اس نظریہ میں وہ کشش و جذب نہیں رہا جس سے وہ ایسے سائنس دان گروہ کو اپنی طرف کھینچ سکے، جس میں آپ حضرات شامل ہیں،

پہلی رکاوٹ اس قطعی انحصار سے متعلق ہے، جو انسان کی روحانی زندگی کا مغز انسانی پر ہے، محققین عضویات[1] کہتے ہیں، اور یہی بات آپ آئے دن ان لوگوں سے بھی سنتے رہتے ہیں، جو سائنس کے رسالوں اور کتابوں کو پڑھتے رہتے ہیں، کہ "ہم حیات بعد الموت کے

[1] Physiology

قائل کیسے ہو سکتے ہیں، جب کہ سائنس نے یہ بات بلا شک و ریب ثابت کردی ہے کہ ہماری شعوری اور روحانی زندگی درحقیقت ماموریت[1] ہے، اس مٹیالے رنگ والے مادے کی جس سے ہمارے جرم مغزی کے پیچ بنے ہیں، جب یہ مٹیالے رنگ والا عضو (یعنی مغز) ہی موت کی وجہ سے گل سڑ جائے گا، تو اس عضو کی ماموریت کیسے باقی رہے گی،"؟

اسی طرح خیال کیا جاتا ہے، کہ جدید "نفسیات عضویہ[2]" ہمیں حیات بعد الموت کے پُرانے عقیدہ سے باز رکھتی ہے، چنانچہ اس وقت میں جدید سائنس کے ایک مفکر کی حیثیت سے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آئیے اور اس اعتراض کو ذرا غور سے دیکھئے،

یہ صحیح ہے کہ علم عضویات اسی نتیجہ تک پہنچا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے، کہ اس نتیجہ پر پہنچ کر اس علم نے نوعِ انسانی کے اعتقادِ مشترک کو ذرا دور تک پہنچا دیا ہے، مثلاً ہر شخص جانتا ہے، کہ کسی انسان کے مغز کا ارتقا اگر رُک جائے تو وہ کودن کہلاتا ہے، جب کسی شخص کے سر پر سخت چوٹ آتی ہو تو اس کا حافظہ بلکہ اس کا شعور بھی معطل ہو جاتا ہے، اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے، جب کسی شخص کو کوئی محرکِ دماغی دوا یا زہر دیا جاتا ہے، تو اس کے خیالات کی کیفیت بالکل بدل جاتی ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری شعوری زندگی کا انحصار ہمارے دماغ پر ہے، علم عضویات، علم تشریح اور علم امراض کے محققین نے اس عام عقیدہ کو تفصیل اور باریک بینی سے بیان کر دیا ہے، سائنس کی کارگاہوں نے اور اسپتالوں نے پچھلے دنوں ہمیں صرف یہی نہیں بتایا کہ عام فکر، مغز کی ماموریتوں میں سے ایک

[1] کسی عضو کے مخصوص کام کو اس کی ماموریت کہتے ہیں، مثلاً پھیپھڑوں سے ہم سانس لیتے ہیں، تو سانس لینا ماموریت ہوئی پھیپھڑوں کی، اسی طرح صفرا پیدا کرنا ماموریت ہے جگر کی،
مترجم،

[2] Physiological Psychology

ماموریت ہے، ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ فکر کی مختلف حالتیں مغز کے خاص خاص حصوں کی ماموریتیں ہیں، مثلاً جب ہمارا فکرؔ اشیا کے دیکھنے میں مصروف ہے، تو ہمارے مغز کا پس پشت حصہ مصروف کار ہے، جب ہم کچھ سننے میں مصروف ہیں، تو مغز کے صدغی قطعے کام کر رہے اور جب ہمارا فکرؔ بولنے میں یا الفاظ میں ظاہر ہو رہا ہے، تو مغز کے پیشانی والے حصے مصروف کار ہیں، پروفیسر فلخ سیگ[1] کا جو لائپزک یونیورسٹی جرمنی میں علم کے اس شعبہ کے امام مانے جاتے ہیں خیال ہے کہ مغز کے دوسرے خاص خاص قطعوں اور پیچوں کی وجہ سے ذہنی ترکیب کے وہ اہم کام ہوتے ہیں، جن پر فکر کے نظری عملوں کا انحصار ہے، اس وقت میرے پاس مغز انسانی کا نقشہ موجود نہیں، ورنہ آپ کو یہ تمام قطعات دکھاتا، پروفیسر موصوف کا خیال ہے، کہ ہماری جذباتی زندگی کی رنگ آمیزی کا انحصار اور ان باتوں کا انحصار کہ کوئی خاص شخص سنگدل مجرم ہوگا، یا وحشی ہوگا، یا اس قدر رقیق القلب ہوگا، جس میں جذبات کا توازن سرے سے غائب ہی ہو جائے، یا ایسا صحیح القلب انسان ہوگا، جس کے اخلاق میں جذبات کو بھی دخل ہو، لیکن اخلاقی وقار بھی قائم رہے، وغیرہ تمام تر مغز انسانی کے ان ہی حصوں کی (جنھیں یہ مصنف حسیات کے مغزی حصے کہتا ہے) باہمی ملاوٹوں اور رشتوں کی افراط و تفریط پر منحصر ہے، ممکن ہے یہ رائے بعد میں قابل تصحیح ثابت ہو، لیکن موجودہ ماہرین تشریح امراض و عضویات کے نتائج اس قدر پختہ معلوم ہوتے ہیں، کہ ہمارے نوجوان طلبا، کو یہ باتیں بلا تکلف طبی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، اس وقت ان علوم میں جو تحقیق و تجسس جاری ہے، اس کا جذبۂ محرک یہی یقین ہے، کہ مذکورہ بالا تعلق (مغز اور شعور کے درمیان) ایک غیر متزلزل حقیقت ہے، کسی نوجوان نفسی سے پوچھ لیجئے، وہ آپ سے یہی کہے گا، کہ چند فرسودہ دماغ متکلمین، مخبوط الحواس تھیوسوفٹ[2]

۱؎ Professor Flechsig Leipzig. ۲؎ تھیوسوفی سے مراد علم حضور حق

و محققین علم الارواح کے سوا کوئی شخص بھی آج کل یہ دعویٰ نہیں کریگا کہ ذہنی یا نفسی حالتیں دنیا میں رقم متغیر[1] کی طرح خود مختارانہ حیثیت رکھتی ہیں،

میں بھی اس نظریۂ "انحصار ذہن بر مغز" کو اپنے استدلال کے لئے بے چون و چرا اور بلا کم و کاست تسلیم کر لیتا ہوں، اور آپ حضرات سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس تعلق کو ایک کلیہ مسلمہ کی طرح مان لیں،

مان لیجئے کہ فکر مغز کی ایک ماموریت ہے، اب سوال یہ ہے کیا اس نظریہ کو صحیح مان لینے سے ہمارے لئے حیات بعد الموت کا حق تسلیم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، اگر کوئی صحیح العقل مفکر اس نظریہ کو ایک کلیہ مسلمہ مان لے تو کیا اُسے حیات بعد الموت کے متعلق اپنی تمام امیدیں قربان کر دینا پڑیں گی،؟

جن لوگوں میں سائنس کی عصبیت حد سے زیادہ سخت گیر ہے، وہ تو بے چون و چرا کہہ دینگے کہ ہاں البتہ اگر کوئی نوجوان طبیب یا نفسی اپنی علمی تربیت کے باوجود بھی حیات بعد الموت پر یقین قائم رکھنا چاہتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے، کہ خوش قسمتی سے انسان کو منطقی ربط کے علاوہ ڈل کی بے ربطی سے بھی سرفراز کیا گیا ہے، وہی شخص جو ابھی سائنس دان کی حیثیت سے مشغول فکر تھا، فوراً ہی ایک عامی یا ایک عیسائی کی زبان سے بولنے اور سوچنے لگتا ہے، ایک عامی کی حیثیت سے اس کے دل میں بقا کی لو لگی ہوتی ہے، اور اُسے یہ خیال نہیں آتا، کہ ابھی ابھی تو میں اس بقا کو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۶) ہے، تھیوسوفی وہ عارف ہے، جو خدا کے دیدار کا دعویدار ہے اسلام میں ابن عربی مشہور صوفی تھے، مترجم، ۱؎ رقم متغیر ریاضیات کی اصلاح ہے، مثلاً اگر کہا جائے کہ تمام ک فانی ہیں، تو اگر ک کے بجائے انسان بندر گدھے لکھیں تو قضیہ صحیح رہے گا، ک "رقم متغیر" کہلائے گا، (مترجم)

سائنس سے غلط ثابت کر چکا ہون، ہان جو شخص سائنس کی عصبیت میں اس قدر رنگا جا چکا ہے کہ سوائے اس ایک نقطۂ نظر کے اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں، وہ بلا تامل حیات بعد الموت کی خواہش اور لذت کو خوشی یا ناخوشی سے قربان کر دیے گا،

یہ ہے پہلا اعتراض حیات بعد الموت کے عقیدہ کے خلاف، اب میرا فرض یہ ہے کہ میں آپ صاحبوں کے سامنے واضح کر دوں کہ استدلالی حیثیت سے یہ اعتراض صحیح نہیں، میں دکھاؤں گا کہ اس اعتراض سے حیات بعد الموت کی عدمیت لازم نہیں آتی، بلکہ اگر ہم نظریۂ "انحصار فکر بر مغز" کو حرف حرف بھی صحیح مان لیں، تب بھی یہ بات ناممکن نہیں، بلکہ ممکن ہے، کہ مغز کے گل سڑ جانے کے بعد بھی ہماری حیات باقی و جاری رہے،

جو لوگ مغز کی عدم موجودگی میں حیات کے بقا کو ناممکن سمجھتے ہیں، اونھون نے متذکرہ بالا نظریۂ انحصار ماموری کو بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے، اب ذرا اس انحصار ماموری کو غور سے دیکھیے، اور پھر یہ سوال کیجئے کہ انحصار ماموری کی کتنی قسمیں ہیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ کم از کم ایک قسم کا انحصار تو ایسا ضرور موجود ہے، جو حیات بعد الموت کو مانع نہیں، منکر عضویات ایک اور قسم کے انحصار کو دیکھتا ہے، اور اس کو بلا وجہ ممکن اور صحیح سمجھ کر حیات بعد الموت کا انکار کر دیتا ہے،

جب یہ منکر عضویات دعوی کرتا ہے، کہ "فکر مغز کی ایک ماموریت ہے"، اور اس لئے مغز کی عدم موجودگی میں فکر باقی نہ رہے گا، تو اس کے ذہن میں ایک غلط تمثیل ہوتی ہے، وہ اپنے اس دعوی کو اسی قسم کا سمجھتا ہے، جس قسم کے یہ دعوے ہیں، کہ بھاپ کیتلی کی ماموریت ہے، یا روشنی برقی رو کی ماموریت ہے، یا قوت گرتے آبشار کی ماموریت ہے، وغیرہ ان تینوں مثالوں میں مختلف مادی اشیا، کی ماموریت یہ ہے، کہ وہ (اپنی ہر طرح کی) مادی اشیا (یا نتائج پیدا کرین ایسی ماموریت کو ماموریت تولیدی کہنا چاہئے، پس منکر عضویات مغز کے متعلق بھی یہی حکم لگا دیتا ہے وہ سمجھتا ہے

کہ جس طرح مغز کاربولک[1] ایسڈ، پیدا کرتا ہے، یا جو ہر لحم[2] اور کلسٹرین[3] کی مادی رطوبتیں پیدا کرتا ہے اور یہ بلا شبہہ ماموریت تولیدی ہے،) اسی طرح مغز فکر کو بھی پیدا کرتا ہے، اگر ہم اس منکر کا یہ خیال صحیح مان لیں، کہ مغز کا فکر کو پیدا کرنا، درحقیقت ماموریت تولیدی ہے، تو مغز کی فنا کے بعد روح کی فنا بھی لازم آئے گی، کہ جب پیدا کرنے والا عضو ہی نہ رہے گا، تو وہ شے کیسے رہے گی، جو اس عضو سے پیدا ہوتی ہے، تولیدی ماموریت سے یہی نتیجہ نکلتا ہے،

لیکن مادی دنیا میں صرف تولیدی ماموریت ہی دکھائی نہیں دیتی، دو اور طرح کی ماموریتیں بھی ہیں جنھیں اذنی (اختیاری) اور انتقالی کہا جاسکتا ہے،

مثلاً کمان زنبور کے گھوڑے کی ماموریت کیسی ہے؟، اذنی ہے، کیونکہ یہ گھوڑا اس رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے، جو کمان کی رسی کو روکے رکھتی ہے، جب ہم گھوڑے کو کھینچتے ہیں، تو گویا وہ اجازت دے دیتا ہے، کہ کمان اپنی اصلی حالت و صورت میں آجائے، یہی ماموریت ہمیں اس وقت نظر آتی ہے، جب ہتھوڑا (یا بندوق کا گھوڑا) کسی پھٹنے والے مرکب (مثلاً بارود) پر گرتا ہے، یہ ہتھوڑا بارود کی مشتمل گیسوں کی ذراتی رکاوٹوں کو ہٹا دیتا ہے، اور اجازت دیتا ہے کہ یہ گیسیں اپنا اصلی حجم اختیار کر لیں، بھک سے اڑ جانا اسی کو کہتے ہیں،

اب کسی رنگدار شیشے کا مثلاً منشور مثلثی[4] یا انتشاری شیشہ[5] کو لیجئے، ان کی ماموریت انتقالی ہے، اس شیشہ کی ماموریت یہ ہے، کہ نور کی قوت کو، خواہ وہ نور کیسے ہی پیدا ہوا ہو، رنگ میں محدود کر کے اسے چھان چھان کر ایک خاص راستے میں اور ایک خاص صورت میں محصور کر دے اسی طرح ارگن باجہ کے پردون کی ماموریت بھی انتقالی ہے، ان کے یکے بعد دیگرے دبانے

ف۱ Carbolic acid ف۲ Creatni ف۳ Cholesterin
ف۴ Prism ف۵ Lens.

جانے سے باجہ کی نلیاں کھل جاتی ہیں، اور صندوق کی ہوا ان راستوں سے باہر نکلتی ہے ہر نالی کی آواز کیا ہے؟ ہوا کی ایک لہر ہے جو ستون نما ہو کر لرزتی ہوئی اس نالی میں سے نکلتی ہے، کیا باجہ ہوا پیدا کر رہا ہے؟ ہر گز نہیں، ہوا صندوق میں موجود تھی، اور باجہ صرف ایک ساز ہے، جس کی چھوٹی بڑی نالیاں اس صندوق کی ہوا کے نکلنے کے لئے راستوں کا کام دیتی ہیں،

اب میرا دعویٰ یہ ہے کہ جب ہم اس کلیہ کا تصور کرتے ہیں، کہ فکر مغز کی ایک ماموریت ہے، تو ہمارے لئے ضروری نہیں کہ ہم صرف تولیدی ماموریت ہی کو مانیں ہمیں حق ہے کہ اس کے علاوہ اذنی اور انتقالی ماموریتوں پر بھی نظر کریں، عام نفسی عضویین اس پہلو کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں،

فرض کیجئے کہ عالم کائنات کا یہ پورا مادی نظام تحت الثریٰ سے بام ثریا تک، حوادث قدرت کی محض ایک سطحی نقاب ہے، جو اس عالم کی اشیائے واقعی کو ہماری نظروں سے چھپا رہی ہے، ایسے مفروضے سے عوام اور فلسفی نا آشنا نہیں ہیں، عوام تو اس خیال کے کہ ظاہری حوادث نے اشیائے واقعی کو چھپا رکھا ہے، اس درجہ قایل ہیں، کہ اوہام باطلہ تک نوبت جا پہنچی ہے، فلسفہ عینیت دعویٰ کرتا ہے کہ مشاہدات فطری کا وہ سارا نظام جو ہم دیکھ رہے ہیں درحقیقت ایک نقاب زمانی ہے، جو پس پردہ فکر بے کران کو ان لاتعداد لیکن محدود شعوری حالتوں میں پراگندہ کر دیتا ہے، جنھیں ہم اپنی اپنی شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں شاعر نے کہا ہے؛

"حیات مختلف رنگوں والے شیشہ کے گنبد کی طرح ابدیت کے سفید نور کو رنگین، کر دیتی ہے"،

اب فرض کیجئے کہ شاعر نے سچ کہا ہے، یہ بھی فرض کر لیجئے، کہ یہ گنبد جو عام حالتوں میں اور عام اوقات میں تو اس فوق الشمس نور کے لئے کثیف ہے، لیکن بعض اوقات اور بعض جگہوں

میں اپنی کثافت کو کم کر دیتا ہے، اور اس ابدیت کے نور کی چند کرنوں کو ہماری تحت القمر دنیا میں گذر جانے کی اجازت دیتا ہے، تو یہ کرنیں کیا ہوں گی؟ یہ کرنیں ہوں گی شعور کی محدود شعاعین جس تناسب سے اس گنبد کی کثافت بڑھتی یا گھٹتی جائے گی، اسی تناسب سے ان شعاعوں کی کیفیت و کمیت بھی کم و بیش ہو گی، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ خاص خاص مواقع اور خاص خاص حالات میں فطرت کی یہ نقاب اس قدر باریک ہو جاتی ہے، کہ عالم بالا کی یہ کرنیں اس میں سے راستے پیدا کر کے نکل آتی ہیں، یہی وہ جگہیں، اور وہ مواقع ہیں، جہاں ہمیں عالم بالا کی قائم بالذات زندگی کی کچھ شعاعیں بخشی جاتی ہیں، خواہ ان شعاعوں کا پرتو ہمیں محدود اور غیر تشفی بخش ہی کیوں دکھائی دے، ایسی حالتوں میں ہماری محدود دنیا کو کبھی تو تابش جذبات عطا ہوتی ہے اور کبھی عرفان کی جھلک، کبھی درک مستقیم ملتا ہے، اور کبھی علم کی بارش،

اب اگر آپ اس بات کو تسلیم کر لیجئے، کہ ہمارا مغز پردہ گنبد میں اسی قسم کی ایک باریک اور نیم شفاف جگہ ہے، تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نتیجہ نکلے گا کہ جس طرح سفید نور مختلف رنگوں والے شیشوں سے رنگ آمیز اور کج آمیز ہو کر گنبد کے اندر چھن چھن کر داخل ہوتا ہے، یا جس طرح اس وقت ہوا، میرے حلق کے صوتی تاروں اور نتھوں کی وجہ سے اپنے تموج کی تندی اور کیفیت میں محدود اور محصور ہو کر میری آواز کی صورت میں نکل رہی ہے، اسی طرح حقیقت کا مواد صالح یعنی روحوں کی وہ پر کیف زندگی جو ان کا حق ہے، ہمارے مختلف دماغی پردوں کو چیرتی ہوئی اس دنیا میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن کس حالت میں؟ نقائص سے ملوث ہو کر، بوالعجبیوں سے پر ہو کر اور صورتوں میں محدود ہو کر، ان محدود اور ناقص صورتوں کا کیا نام ہے؟ یہ ہیں ہماری شخصیتیں!

شیشہ گنبد کی یہ کثافت مغز انسانی کی حالت کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی ہے، جب مغز

اپنی پوری قوت سے کام کرتا ہے، تو یہ رکاوٹ اس قدر کم ہو جاتی ہے، کہ روحانی قوت کا ایک سیلاب آجاتا ہے، دوسری حالتوں میں فکر کی صرف وہ لہریں آپہونچتی ہیں جنھیں گہری نیند کے وقت آنے کا موقع ملتا ہے، اخیر میں جب مغز اپنا کام بالکل چھوڑ دیتا ہے، یا بالکل فنا ہو جاتا ہے، تو شعور کی وہ تُندی جو اس مغز کے راستہ سے جاری تھی، ہماری اس طبیعی دنیا سے بالکل غائب ہو جاتی ہے، لیکن ہستی کا وہ ذخیرہ جو اس چشمہ کا منبع تھا اب بھی موجود رہے گا، کیا تعجب ہے، کہ یہ چشمہ اس حقیقی دنیا میں اب بھی جاری ہو، اگرچہ اس وقت ہم اس کے انداز و رفتار سے ناآشنا ہیں،

آپ نے دیکھ لیا کہ انسان کی روحانی زندگی کے متعلق جو مفروضہ میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے، اس کے مطابق بھی یہ زندگی بالکل صحیح معنوں میں "مغز کی ماموریت" ہے، مغز تو متغیر بلا واسطہ ہوگا، اور نفس و ذہن کا تغیر اس سے بالواسطہ ہوگا[1]، لیکن اگر اس طبیعی دنیا میں ہماری ذہنی زندگی مغز پر منحصر ہے، تو اس سے حیات بعد الموت کا ناممکن ہونا لازم نہیں آتا، مغز کی فنا کے بعد بھی حیات اس پس پردہ اور فوق الطبیعی منبعِ حیات کے ساتھ ملحق اور جاری رہ سکتی ہے جس سے اس کا اس فانی دنیا میں تعلق تھا،

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مادیت نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ لابدی نہیں ہے، یہ نتیجہ صرف اسئے نکلا، کہ مادیت نے ماموریت کی صرف ایک صورت کو لیا ہے، ہمارا فرض ہے کہ ناقدانہ حیثیت سے ہم مادیت کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کریں، کہ وہ ایک صاف اور اہم نقطۂ نظر کو بلاوجہ نظرانداز کر رہی ہے، یہ احتجاج ہمارا فرض ہے، خواہ ہمیں مسئلہ بقا سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، جب ہم یہ سوچتے ہیں، کہ سچائی کا اقتضا، کا بھی یہی ہے پھر جب مادیت جان بوجھ کر نوع انسانی کی اہم ترین آرزو کی تنقیص کر رہی ہے، تو ہمارا یہ فرض اور موکد ہو جاتا ہے،

[1] یعنی نفس و ذہن کا انحصار مغز پر ہوگا، لیکن مغز کا انحصار ذہن و نفس پر نہ ہوگا،

مختصر یہ کہ منطقی حیثیت سے تو ہم نے مادیت مغزی کے زہریلے دانت نکال لئے، اب میں چاہتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ آپ کی خواہشات کے لئے "ادنی ماموریت" کا کام دیں، اور آپ کا فرض یہ ہے، کہ حیات بعد الموت پر یقین رکھیں، البتہ یہ آپ کی مرضی ہے، کہ آپ اس حق سے مستفید ہوں، یا نہ ہوں، بہرحال چونکہ مذکورہ بالا بحث قدرے روکھی پھیکی تھی، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے بعض زیادہ محسوس پہلوؤں کے متعلق بھی کچھ کہوں،

خیالی مفروضے بہت بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ خیال کس قدر عجیب معلوم ہوتا ہے، کہ "ہمارا مغز فطرت کی دیوار میں ایک رنگ دار شیشہ ہے، جس میں سے ایک فوق الشمس منبع سے نکلا ہوا نور محدود اور رنگ آمیز ہو کر داخل ہو رہا ہے،" آپ کہیں گے یہ تو محض ایک لایعنی سا استعارہ ہے، ہم اپنے ذہن میں ایسی ماموریت کا اندازہ ہی کیسے کر سکتے ہیں؟ کیا عام مادیت کا مفروضہ (کہ ذہن ماموریت ہے مغز کی،) اس سے زیادہ صاف اور عام فہم نہیں ہے؟ کیا ہمارا شعور درحقیقت بھاپ یا برقی رو یا اعصابی رو کی طرح نہیں ہے جنھیں انکے مخصوص ظرف یا عضو ہی پیدا کرتے ہیں؟ کیا علمی ربط کی حیثیت سے یہ زیادہ صحیح نہیں ہے کہ ہم مغز کی ماموریت کو بھی تولیدی ماموریت تصور کریں؟

ان اعتراضات کا فوری جواب یہ ہے، کہ اگر آپ سائنس کی واقعی حیثیت کے متعلق بات چیت کر رہے ہیں، تو یاد رکھئے کہ سائنس میں ماموریت سے مراد ہے، باہمی تغیر و تبدل جب مغز میں ایک طرح کا تغیر واقع ہوتا ہے تو شعور (یا ذہن) میں بھی ایک قسم کا تغیر ہوتا ہے، مثلاً جب اعصابی رو مغز کے پشت کے حصہ میں دوڑتی ہے تو شعور کی حالت وہ ہوتی ہے جسے دیکھنا کہتے ہیں، جب یہ رو پیشانی والے حصہ میں دوڑتی ہے تو شعور کی حالت وہ ہوتی ہے جسے بولنا کہتے ہیں اور جب یہ مختلف رویں بند ہو جاتی ہیں، تو شعور کی حالت نیند کی ہوتی ہے، سائنس ہمیں صرف یہ اجازت دیتی ہے کہ ہم اس تبدل باہمی کو بطور امر واقعہ کے بیان کر دیں۔ باقی رہی یہ بحث کہ جو کچھ اس باہمی تبدل کے ذریعہ

سے ہو رہا ہے، وہ تولیدی ہے یا انتقالی، یہ محض مفروضے ہیں، جو سائنس داں اپنی طرف سے بڑھا دیتا ہے، اور پھر یہ مفروضے بھی (طبیعی نہیں ہیں بلکہ) مابعد الطبیعی ہیں، کیونکہ خواہ ہم ماموریت کی ایک قسم کو لیں، یا کسی اور قسم کو ہم اسکی تفصیل کے تصور سے عاجز رہتے ہیں، سائنس سے پوچھئے کہ یہ تولید یا یہ انتقال ہوتا کیسے ہے تو آپ کو سوائے خاموشی کے کوئی کا جواب نہ ملے گا، اس دقت سائنس سے آپ کو اس مسئلہ کا حل تو کیا ملے گا، وہاں تو اٹکل یا قیاس محض کی ایک جھلک تک موجود نہیں، کوئی ادنیٰ سا استعارہ تک نہیں، کوئی تجت تک نہیں، جس کی مدد سے ان مختلف ماموریتوں کے متعلق کچھ تفصیل سے کہنے کی جرات کی جاسکے، لاعلمی اور محض لاعلمی یہ ہوگا جواب ماہرین عضویات کا ایک ماہر نے سچ سچ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں، جیسا کہ برلن کے پچھلے استاذِ عضویات نے کہا ہے، کہ مغز میں شعور ایسی حالت کا پیدا ہونا دنیا کا سب سے بڑا معمہ ہے، یہ معمہ اس قدر بعید از قیاس اور غیر معمولی ہے کہ اسکی حیثیت قدرت کے قوانین کے سمجھنے میں ایک عیب سنگِ راہ کی سی ہے، معمہ کیا ہے قریب قریب ایک تضاد لفظی ہے، جب چائے کی کیتلی میں بھاپ پیدا ہوتی ہے، تو ہمیں کم از کم عرفان قیاسی تو ہوتا ہے، کیونکہ اس میں تغیر پذیر رقمیں مادی حیثیت سے بالکل ہم جنس ہیں[1]، اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تغیر درحقیقت ذرّوں کی حرکت کا تغیر ہے، اور بس لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ مغز نے شعور پیدا کیا، تو رقوم متغیر بالکل مختلف الجنس ہوتی ہیں، (یعنی ایک مادی اور دوسری غیر مادی) اسلئے جہاں تک عقل و فہم کا تعلق ہے، یہ کہنا کہ شعور مغز سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح ایک معجزہ ہے، جیسے ہم یہ کہیں کہ شعور خود رو ہے، یا شعور نیست سے ہست ہوا ہے،

[1] یعنی آگ، پانی، اور کیتلی، تینوں مادی اشیا ہیں یعنی مادی علت نے مادی معلول پیدا کیا، لیکن جب مغز نے (جو مادی ہے) (جو روحانی ہے) شعور پیدا ہوا تو مادی علت نے غیر مادی معلول پیدا کیا۔

الغرض نظریہ تولیدی (یعنی مادیت کا نظریہ) بذات خود کسی دوسرے نظریہ سے ذرہ برابر بھی زیادہ صاف یا زیادہ عام فہم نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے، کہ آج کل یہ نظریہ زیادہ دلعزیزی ہو رہا ہے، اگر مادئین میں سے کوئی صاحب ہم پر یہ اعتراض وارد کریں، کہ فرمائیے، مغز حدبندی اور تقیید کرنے والا عضو بن کیسے سکتا ہے، ایک ایسے شعور کے لئے جس کا منبع کسی دوسرے عالم میں ہے، تو ہمیں اُسے یہ دنداں شکن جواب دینا چاہئے، کہ آپ ہی فرمایئے، کہ مغز سے شعور کیسے پیدا ہو جاتا ہے، ؟ جہاں تک بحث و استدلال و فہم کا تعلق ہے، دونوں نظریے برابر کی اہمیت رکھتے ہیں،

لیکن جب آپ ہمارے نظریہ ماموریتِ انتقالی کو ذرا زیادہ واضح کر کے دیکھیں گے تو اس میں آپ کو (مسئلۂ بقا سے قطع نظر کر کے بھی) چند ایسی ایجابی خوبیاں ملیں گی جو اس کے مقابل کے نظریہ میں نہیں مل سکتیں،

یہ ہمیں نہیں معلوم کہ ماموریت انتقالی کام کیسے کرتی ہے، لیکن اس عمل کے ظاہری تعلقات سے ہمارے نظریہ کو تقویت پہونچتی ہے، مثلاً ہمارے اس نظریہ کے مطابق یہ مسئلہ باقی ہی نہیں رہتا کہ شعور اس قدر زیادہ اور مختلف مقامات میں رقم نو کی طرح پیدا کیسے ہو جاتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ یہ شعور پس پردہ اسی وقت سے موجود ہے، جب سے دنیا موجود ہے، اسی طرح ہمارے نظریہ انتقالی کے لئے یہ سوال بھی باقی نہیں رہتا کہ پیدائش شعور کی معجزانہ نمود اس قدر زیادہ جگہوں میں کیونکر ہوئی، ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ مادیت کی تولیدی نظریہ کے برعکس یہ نظریہ عام فلسفہ عینیت سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، اگر کسی مسئلہ میں سائنس اور فلسفہ متفق ہو جائیں، تو غنیمت سمجھنا چاہیئے،

(باقی)

تبصرہ و تلخیص

ڈاکٹر کریمر اور اسلام

عیسائیوں کی بین الاقوامی تبلیغی مجلس کی فرمایش پر ڈاکٹر کریمر نے ایک کتاب موسوم بہ "عیسائیوں کا پیام غیر عیسائی دنیا میں" لکھی ہے، اس کے اقتباسات رسالہ مسلم ورلڈ میں شائع ہوئے ہیں، ذیل میں ان کی تلخیص دیجاتی ہے، کہ اس سے اسلام کے خلاف عیسائیوں کی معاندانہ تبلیغی کوششوں کا اندازہ ہوسکے، اور یہ معلوم ہوسکے کہ اس آزادی اور روشن خیالی کے دور میں بھی متعصب عیسائی اسلام کے متعلق کیسے خیالات ظاہر کرتے ہیں،

مذہب اسلام اسلام یہودی اور عیسوی مذہب کی ایک شاخ ہے، اس لئے اس کی حیثیت فطری مذاہب سے جداگانہ ہے، لیکن یہ اپنی خود شعوری کی وجہ سے ان دونوں قدیم مذاہب سے بالکل آزاد اور علیحدہ رہا ہے، اس کے عقائد سادہ اور مختصر ہیں، اور مذہبی مسائل تو بہت ہی سطحی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کے پیرو اپنے عقائد میں اسقدر راسخ اور سخت ہوتے ہیں، کہ ان کے لئے وہ اپنی جانیں گنوا سکتے ہیں،

اسلام نے مذہب و اخلاق کے سارے مسائل کو غیر تشفی بخش طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک الہامی مذہب ہے، لیکن اس کا الہام محض قرآن کا مکینکل الہام ہے، جس کو قدیم، غیر مخلوق اور آسمانی سمجھا جاتا ہے،

اسلام میں گناہ اور نجات کا تخیل بھی اطمینان بخش نہیں، اللہ کی قدرت کاملہ کے سامنے تسلیم و رضا کے سوا کوئی اور چارہ نہیں اخلاقی حیثیت سے نجات کو اہمیت زیادہ نہیں دی گئی، پھر بھی

ایسے اوتھلے اور سطحی مذہب کے پیرو اپنے عقائد میں دوسرے تمام مذاہب کے پیرووں سے زیادہ سخت ہیں، اس کے دو وجوہ ہیں، ایک تو یہ کہ اسلام میں اللہ کی قدرت کاملہ اور جباری پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ پیروان اسلام کو ایک متحدہ قوم قرار دیکر اللہ اور اسکے رسول کی شریعت کے ماتحت کر دیا گیا ہے، چنانچہ اسلام ایک حکومت الٰہی ہے، جس میں اللہ ہی ہر چیز ہے، اللہ اور بندہ میں کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ بندہ کا وجود محض اللہ کا حکم بجالانے کے لئے ہے، اس تخیل کے ساتھ اسلام نے جو قوم پیدا کی، وہ ایک ہی وقت میں مذہبی بھی ہے سیاسی بھی، اور معاشرتی بھی، اور ان سب کا محور اسلامی شریعت ہے، اسی لئے اسلام جدید طرز اختیار نہیں کرسکتا، اسلام کی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے محمدؐ نے یہ دعویٰ کیا کہ صرف یہی ایک مذہب ہے، جو احکام الٰہی کی رو سے دنیا کے مذہبی اور غیر مذہبی معاملات میں حکمرانی کرسکتا ہے، گویا اسلام شروع میں مذہبی شہنشاہیت کا نمونہ تھا،

اسلام ایک تمدن ہے، دوسرے مذاہب کی طرح اس کا تاریخی نشو و نما بھی ہوا ہے، اسلئے اسکے دوسرے اجزا مثلاً اس کے اخلاق کا نظام اور تصوف کی آمیزش بھی قابل غور ہیں، اسلام غیر صوفیانہ مذہب بلکہ تصوف کا مخالف ہے، لیکن نو مسلم عیسائیوں کے اثرات سے اس میں تصوف کا رنگ پیدا ہوگیا ہے، عیسائی خدا کی ذات سے محبت اور خط اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مسلمان خدا کی ہیبت سے متاثر ہونے پر زور دیتے ہیں، الغزالی نے شریعت علم کلام اور تصوف میں امتیازات قائم کئے، اور تصوف کو قلب کے ایسے تاثرات بتائے، جو مذہبی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں لیکن قرآن کی الفاظ و احکام کی پابندی کو ہر حال ضروری اور لازمی قرار دیا،

اسلام کی موجودہ حالت اسلام وحشی قبائل میں تیزی سے بڑھ رہا ہے، افریقہ اور نیدرلینڈ کے قبائل اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام یا عیسوی مذہب کی طرف مائل ہو رہے ہیں، ان ممالک

میں اسلام کی تبلیغ ازمنۂ وسطیٰ ہی سے شروع ہو گئی تھی، خصوصاً جب اس کو یہاں سیاسی اقتدار بھی حاصل تھا،

موجودہ دور میں اسلام کے فروغ کے تین اسباب ہیں (۱) مغرب کے باہمی تصادم سے قبائلی مذاہب میں انتشار پیدا ہو رہا ہے، اور لوگ ایک نئے روحانی ماحول کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، (۲) مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمی سے وہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جو اپنے قبائلی مذہب سے بالکل مطمئن نہیں، (۳) ان وحشی لوگوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی میں اسلام بہت زیادہ تغیر پیدا نہیں کرتا،

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے، کہ اسلام صرف ایک شرعی نظام نہیں، بلکہ ایک مکمل تمدن اور سیاسی مذہب ہے، اسلئے موجودہ دور میں دو مسائل قابلِ توجہ ہیں، اسلام کی سیاسی حالت اور اسلام کے یکسان تمدن کا جدید تمدن سے تصادم، اسلام میں کمتری کا احساس نہیں ہے، اسلئے جب یہ مغربی تمدن سے متصادم ہوا، تو تلخ تجربے حاصل ہوئے، اور جب اسلام کا سیاسی اقتدار کم ہوا، تو دو ردِ عمل ہوئے، (۱) اسلام کے قدامت پسند عناصر نے یوروپین کلچر کو ناقابلِ قبول سمجھا، (۲) اعتدال پسند طبقہ کو اسلام کا رجعت پسندانہ رویہ پسند نہ تھا، لیکن ان کا خیال تھا، کہ اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو اسلام اور یورپ کے خیالات میں کچھ فرق نہ رہ جائے گا، اس خیال کے ماتحت اصلاح کی کوششیں شروع ہوئیں، چنانچہ ترکی میں روس کے ذلت آمیز صلحنامہ (۱۷۷۴ء) کے بعد اسی قسم کی کوشش کا آغاز ہوا، مصر میں محمد علی نے بھی اسکی تقلید کی، مگر خلاف توقع وہان مغربی تمدن پھیل گیا،

جنگِ عظیم کے بعد حالات بدل گئے ہیں، عربی بولنے والی قوموں نے اپنا سیاسی اقتدار حاصل کر لیا ہے، ترکی اور ایران بھی اب بالکل آزاد ہیں، ان انقلابات سے یورپ کی سیاسی قوت کو سخت صدمہ پہنچا ہے، اور اس کے تمدن پر آج غیر معمولی دباؤ پڑ رہا ہے،

اجنبی حکومت کے ماتحت رہنے والے مسلمانوں کے حالات اس سے مختلف ہیں، گو انھوں نے بھی جدید تمدن کو قبول کیا ہے، لیکن مذہبی معاملات میں وہ آزاد ممالک کے مسلمانون سے زیادہ قدامت پسند ہیں، ہندوستان میں قومیت ہندوؤں میں زیادہ ہے، یہان کے مسلمان اسلام کو ہندوستانی قومیت سے مقدم سمجھتے ہیں، اور پبلک زندگی میں اپنی جماعت بندی کے لئے اسلام ہی کو طرۂ امتیاز بنانا چاہتے ہیں،

مصر میں وفدی جماعت کا رجحان زیادہ تر مغرب کی طرف ہے، اور وہ ملک کو جدید دنیا کے مطابق بنانا چاہتے ہیں، لیکن وہان کا قدامت پسند طبقہ یوروپین خیالات کو مطلق پسند نہیں کرتا ہے، اور اسلام کو اپنی اصلی مذہبی اور تمدنی حالت پر واپس لانا چاہتا ہے، چنانچہ مصر کو تمام اسلامی دنیا کا مرکز بنانے کی کوشش کیجا رہی ہے،

ترکی میں اسلام لوگون کی زندگی کا جزدِ کل نہیں رہا، بلکہ قومیت کی بڑھتی ہوئی رو میں اسکی حیثیت ثانوی قرار پا گئی ہے، لیکن پھر بھی اس کو اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اسی کے ذریعہ سے سلطنت میں اتحاد کی قوت پیدا کیجا سکتی ہے، چنانچہ اسلام یہاں ایک مذہبی تمدن کے بجائے محض ایک مذہب کی حیثیت سے باقی ہے،

ایران میں مذہبی انقلاب ترکی کی طرح دفعتہً تو نہیں مگر آہستہ آہستہ ہو رہا ہے، یہان مذہبی گروہ کا اثر ترکی سے زیادہ تھا، ۱۹۲۵ء میں جب ایران میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی گئی، تو مذہبی گروہ درمیان میں حائل ہوا، لیکن دس برس کے اندر شاہ ایران نے مجتہدون کے اقتدار کو بڑی حد تک کم کر دیا، اسلام ایران میں اب تک سرکاری مذہب ہے، علماء کی جماعت سرکاری حیثیت رکھتی ہے، لیکن بعض قوانین کے نفاذ، اور عورتون کی آزادی سے اسلام کو سخت صدمہ پہونچا ہے،

اسلام اور عیسائی مبلغین

عیسائی مبلغون کیلئے ایک بڑی مشکل یہ ہے، کہ مسلمان اپنے لئے جماعت بندی مذہب کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں، اسلئے ان میں تبلیغ کی اولین شرط یہ ہونی چاہئے کہ ہمارے مبلغین مسلمانون سے غیر معمولی عقیدت، اخلاق اور محبت سے پیش آئیں، اور امید اور اعتماد میں استوار رہیں،

حضرت مسیح کی تعلیم پر روشنی ڈالنا اور قرآن کی غلط بیانیوں کو دکھانا مسلمانوں کے درمیان کام کرنے کا صحیح طریقہ نہیں، بلکہ قرآن میں انجیل سے جو واقعات لئے گئے ہیں، ان ہی کے اصلی معانی اور مطالب کو بیان کرنا چاہئے، مسلمان ان چیزوں کو توجہ سے سن سکتا ہے، اس کے علاوہ ان سے ذاتی تعلقات پیدا کرکے ان کو انجیل پڑھنے کی ترغیب دلائی جائے اور ان پر یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ عیسائیوں ہی کی طرح بنی نوع انسان ہیں، اور دونوں کی ضرورتیں اور خواہشیں یکسان ہیں، عیسائی مذہب کو عقائد کا مجموعہ بناکر پیش کرنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ اسلام خود عقائد کا ایک مجموعہ ہے، اس کے علاوہ مشرقی گرجاؤن میں مسلمانوں کے سامنے عقائد و رسوم کی بہت ہی ہیبت ناک مثالین رہی ہیں، اس لئے عیسائی مبلغ ان کو بظاہر یہ تعلیم دیکر کہ عقائد کی پابندی کا نام مذہب نہیں، انھیں انجیل کے حقیقی رموز کے مطالعہ کے لئے آمادہ کریں، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمانون کے طرز خیال بود و ماند اور مذہبی لغت سے اچھی طرح واقف ہوں ورنہ اسکے بغیر ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی،

تصوف بھی عیسائی مبلغوں کی کامیابی کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں کے تصوف میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں، اسکے علاوہ مسلمان صوفیوں کی جماعت میں ایسے افراد ملیں گے، جن سے مذہبی اختلاط آسانی سے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اسلامی تصوف کے بعض اجزا مسلمانون کی مذہبی راسخ العقیدگی اور سختی کو بڑی حد تک کم کر دیتے ہیں، لیکن اس موقع

پر اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ ان کو یہ تو بتایا جائے کہ تصوف کا عام رنگ یکسان ہے لیکن اسلام اور عیسوی مذہب کے تصوف کے اساسی خیالات کی وضاحت اور تفریق نہ کیجائے، اس سے پیچیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہے،

موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ عیسائی مبلغوں کی کوشش گذشتہ زمانہ کے مقابلہ میں زیادہ بارآور ہون گی، یا نہیں، کیونکہ اب تک تبلیغ کا کام سیاسی قوتوں کی پناہ میں ہوتا رہا تھا، لیکن آج جہان عیسائی طاقتیں برسر اقتدار ہیں، وہان ان کے خلاف شورش ہے اور اسلام کی مدافعت میں عیسوی مذہب پر جارحانہ حملے ہو رہے ہیں، ٹرکی اور ایران میں تو تبلیغی کام بالکل ممنوع ہے، لیکن وہاں عیسائی مذہب کے آسمانی صحیفہ کے مطالعہ کو رائج کرنا مشکل نہیں،

مشرق میں گرجاؤں کے باہمی عناد اور مبلغوں کے اختلاف سے بھی تبلیغ کو نقصان پہونچ رہا ہے، اس لئے اسے جلد از جلد مٹانے کی ضرورت ہے، ایسا تبلیغی لٹریچر زیادہ سے زیادہ فراہم کرنا ضروری ہے جسمیں مذہبی اصطلاحات اور خیالات نہایت واضح طریقے سے ادا ہوں،

وہ زمانہ قریب آرہا ہے، جب عیسوی مذہب کو کھل کر اسلام سے مقابلہ کرنا ہوگا، افریقہ اور نیدر لینڈ میں وحشی قبائل کے مذاہب ختم ہو رہے ہیں، اور بہت جلد وہاں دونوں مذہب ہون گے، حبشی اسلام کی طرف آسانی سے مائل ہو سکتے ہیں، کیونکہ اس مذہب میں قومیت کا کوئی جھگڑا نہیں اسکے علاوہ ان حبشیون کے معیار زندگی، رسم و رواج اور تعدد ازدواج کے ساتھ اس مذہب کا رویہ ہمدردانہ ہے، لیکن عیسائی مذہب ترقی پسند ہے، اور اسکی بنیاد اخلاق پر ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان اسی جانب راغب ہو، جو اسکے لئے سب سے بہتر ہو،

تبلیغی کامون میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس وقت عیسائی گرجاؤن میں

اتحاد کی سخت ضرورت ہے، اور یہ اتحاد و یکجہتی یوروپین قوموں کی حیثیت سے نہیں بلکہ عیسائیوں کی حیثیت سے ہونی چاہئے، جن کو یہ تعلیم دی گئی ہے، کہ قوم و نسل کی تفریق و امتیاز کے بغیر تمام انسان حضرت مسیح کی نظروں میں مساوی ہیں،

احساسِ کمتری

خاموشی، شرمندگی، رنج و غم، غلط بیانی، فضول گوئی وغیرہ اپنی کمتری کے احساس کے نتائج ہوتے ہیں، بعض اوقات خود رائی، غیر ذمہ دارانہ حرکت یا کسی کام کو انجام دینے میں کوتاہی بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، بچے عموماً اپنے والدین سے غیر معمولی محبت و شفقت کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور جب ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی ہے، تو ان میں عدول حکمی، نافرمانی، اور بداخلاقی جیسے بُرے خصائل پیدا ہو جاتے ہیں، اور وہ سنِ بلوغ کو پہونچکر بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے نابالغ رہتے ہیں، اور ان کو اپنی کمتری کا احساس اتنا زیادہ ہوتا ہے، کہ ان کی انفرادیت باقی نہیں رہتی، ان کے خیال اور عمل کی راہیں بالکل غلط ہو جاتی ہیں، وہ اپنے کو جذبات اور معاشرت کی دنیا میں علحدہ پاتے ہیں، اور اپنی زندگی کو منطقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہو جاتے ہیں، جس سے وہ نہ اپنی سوسائٹی میں کسی مسرت کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اپنے ملک کے لئے مفید ہو سکتے ہیں، وہ خود اپنی زندگی کو خوش اور قانع نہیں بنا سکتے،

اس کمتری کے احساس کو پیدا ہونے سے روکنا یا سنِ بلوغ میں دور کرنا کوئی مشکل کام نہیں، صرف احتیاط شرط ہے،

بچّون کی تربیت میں یہ خیال رکھا جائے کہ ان کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہو، کہ وہ اپنے والدین اور بزرگوں کی نظروں میں محبوب اور مقبول نہیں ہیں، اگر بچے گھر میں اپنے بزرگون سے

ہم آہنگ نہیں ہیں، تو ان کے دلوں سے سکون اور اطاعت گذاری مفقود ہو جاتی ہے، جس کے بعد ممکن ہے، کہ وہ جھوٹ بولنے لگیں، کام سے جی چرانے لگیں، اور بزرگوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کے لئے حیلے اور بہانے ڈھونڈھنے لگیں، بچّون کو ان بُرے خصائل سے محفوظ رکھنے کیلئے ضروری ہے، کہ گھر کے ماحول میں بچّون اور بزرگوں کے باہمی ارتباط کا توازن کسی حال میں بگڑنے نہ پائے،

بڑے بچوں میں کمتری کا احساس محض اسلئے پیدا ہو جاتا ہے، کہ ان کو اپنی ذات سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا خیال ان پر اتنا غالب رہتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات اور اس کے متعلقات کو سوچتے رہتے ہین، ایسے بچّون کے بزرگوں کو چاہئے، کہ ان کو ایسی تربیت دین، کہ وہ اپنی ذات کے بجائے لوگوں کی ذات سے دلچسپی لیں، اور ان سے اخلاق اور مہربانی سے پیش آئیں،

مذکورۂ بالا صورتین تو بچوں سے اس احساس کے انسداد کی تدبیرین ہیں، لیکن سن بلوغ کو پہنچکر بھی اس احساس کے دور کرنے کی کوشش کیجا سکتی ہے، اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے، کہ ہم بغور مطالعہ کر کے یہ معلوم کرین کہ ہم اپنے کو زندگی سے تطبیق دینے میں کہاں کہاں غلطیاں کرتے ہیں، اور ہماری زندگی اور ماحول میں کون ایسے اجزا ہیں، جن میں ترمیم ہو سکتی ہے، اس ترمیم کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے کو ہمیشہ ایک ذہنی آئینہ کے سامنے رکھین تاکہ ہماری خوبیاں اور بُرائیاں بالکل سامنے رہیں، پھر اپنی خوبیوں کو حتی الامکان بڑھاتے، اور بُرائیوں کی اصلاح کرتے ہیں،

اپنی ذات سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے، کہ ہم میں جو کمزوریاں ہوں ان کو اعتراف اور تسلیم کرنے مین کسی قسم کا پس و پیش نہ کرین، اور نہ ہم اپنے لئے کوئی ایسا معیار قائم کرین جو ہمارے

محدود صلاحیتوں سے بہت زیادہ بلند اور اعلیٰ ہو، ورنہ ایک بلند معیار کی تکمیل کی خواہش میں ہم کو عموماً ایسے ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں، جن سے ہماری ذات کو نقصان پہنچتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ یا تو ہم دھوکے اور فریب سے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں، یا خوشامد اور چاپلوسی کو اپنے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں، یا غرور اور گھمنڈ میں خوانخواہ مبتلا ہو جاتے ہیں، یا دوسروں کی تضحیک اور نکتہ چینی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں،

ہم کو جب اپنی کمتری کے احساس کی تمام برائیوں سے واقفیت ہو جائے، تو ان کو دور نہ کرنا محض بزدلی ہے، جو کسی حال میں دوسروں کے رحم و کرم کی مستحق نہیں ہو سکتی،

"ص ع"

سوانح مولینا روم

اسلام کے مشہور صوفی متکلم مولینا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری، فضائل و مناقب، ان کے تصوف کے اسرار، علم کلام کے رموز اور مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، اور اس کے منتخب مضامین پر تبصرہ قیمت :- عہ، ضخامت ۱۸۰ صفحے، (مطبوعہ معارف پریس)

سیرت عائشہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی اور ان کے مناقب و فضائل و اخلاق اور ان کے علمی کارنامے، اور ان کے اجتہادات، اور صنف نسوانی پر ان کے احسانات، اسلام کے متعلق ان کی نکتہ سنجیاں، اور معترضین کے جوابات، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ، ضخامت ۳۵۰ صفحے قیمت :- عہ

"مینیجر"

اخبار علمیہ

چاند کی سیر

انگلستان کے سو آدمیوں کی جماعت ہوائی جہاز کے ذریعہ سے چاند تک پہونچنے کا ارادہ رکھتی ہے، اس سفر میں ۲۵۰۰۰ ڈالر خرچ ہوں گے، جب یہ رقم فراہم ہو جائے گی، تو یہ جماعت فوراً روانہ ہو جائے گی، اس نے اس مجوزہ سفر کی مندرجۂ ذیل تفصیلات شائع کی ہیں،

ہوائی جہاز میں نہانے دھونے کے لئے پانی نہ ہوگا، اور نہ استرے ساتھ ہوں گے، سگریٹ پینا قطعی ممنوع ہوگا، کیونکہ جہاز پر آکسیجن کا ایک ایک انچ انسانی ضروریات کے لئے نہایت بیش قیمت ہوگا پانی اور ہوا، ہائڈروجن پروکسائڈ کی مرکب شکل میں ساتھ ہوگی، ہائڈروجن پروکسائڈ کے ایک سالمہ سے پانی کا ایک اور آکسیجن کا آدھا سالمہ تیار کر لیا جائے گا، پینے کی چیزوں میں صرف کوکو کے استعمال کی اجازت ہوگی، ہاں جب سیاحوں میں سے کسی پر نیند کا غلبہ زیادہ ہوگا، تو تھوڑا سا قہوہ بھی استعمال کر سکیں گے، شراب محض دوا کے لئے ساتھ ہوگی، باورچی خانہ کے برتنوں میں صرف دو بلکی کڑاہیاں ہوں گی، ایک میں پانی گرم ہوگا، اور دوسرے میں گوشت بھونا جائے گا، ہر آدمی کے ساتھ صرف ایک پیالہ، ایک پلیٹ اور ایک چمچہ ہوگا، ایک چھری اور کانٹا بھی ساتھ لیا جا سکتا ہے، جو باری باری ہر شخص کے کام آئے گا، صفائی کا پورا انتظام ہوگا، غلاظت کے لئے ایسی جگہ ہوگی، جس میں ہوا بھری ہوگی، اس کے اوپر کے حصّہ کو کھولنے سے ہوا غلاظت کو اڑا لیجائے گی، تفریح کے لئے ہلکے تاش کے پتوں کا

ایک جوڑ بھی رکھ لیا جائے گا، سردی سے حفاظت کا پورا سامان ہوگا،

آفتاب سے متعلق ایک نیا نظریہ

ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ایک دن آفتاب ہمیشہ کے لئے بجھ جائیگا، ماہرین طبیعیات کی تحقیقات کے مطابق یہ کروڑوں برس سے روشن ہے، اور ابھی کروڑوں برس تک روشن رہیگا، مگر وہ اب تک اس عقدہ کو حل نہیں کر سکے ہیں، کہ اس میں گرمی اور روشنی کیسے پیدا ہوتی ہے، عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اس میں ہائڈروجن جلا کرتا ہے، اور ہائڈروجن کے ذرات کے ٹکڑے شعاعوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، لیکن ابتک یہ واضح نہ ہو سکا کہ یہ تبدیلی کس طرح واقع ہوتی ہے، گذشتہ فروری میں فیلڈلفیا کی ایک سوسائٹی میں ڈاکٹر کارنل بیتھے نے اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر موصوف کا نظریہ ہے کہ ۱۵،۰۰۰،۰۰۰ ڈگری کی حرارت میں ہائڈروجن کے ذرات اپنا اثر کاربن پر ڈالتے ہیں، جس سے یہ کاربن غائب ہو جاتے ہیں، لیکن ہائڈروجن کے دو تین ردعمل کے بعد ظاہر ہو کر پھر اپنا اثر دکھاتے ہیں، اس طرح کاربن بظاہر غائب ہو جاتا ہے، لیکن دراصل ہائڈروجن کو ختم کر کے قوت پیدا کرتا ہے، اور اسی کی خاکستر سے ہیلیم گیس تیار ہوتی ہے،

کاربن کے ذرات کو غائب اور پھر ظاہر ہونے میں ۵۲،۰۰۰،۰۰۰ سال لگتے ہیں، لیکن یہ چکر اس قدر متواتر اور مسلسل ہے کہ آفتاب میں ہمیشہ گرمی پہونچتی رہتی ہے،

ڈاکٹر بیتھے کے اس نظریہ کی جانب کافی توجہ کیجا رہی ہے، ڈاکٹر مذکور اگرچہ اب جرمنی سے جلاوطن ہو کر فیلڈلفیا پہونچا ہے، لیکن وہاں کے سائنٹفک رسالوں میں پرانے نظریوں اور مسائل پر جدید معلومات بہم پہونچانے کی وجہ سے بہت ہی مقبول ہو رہا ہے،

امریکہ کے معلّمین

ممالک متحدہ میں ۲۶،۰۰۰،۰۰۰ طلبہ مختلف اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں، اور ان کے لئے ۱،۰۰۰،۰۰۰ اساتذہ مقرر ہیں، لیکن عام طور سے والدین ان کی تعلیم اور تربیت سے مطمئن نہیں ہیں، ان کی بے اطمینانی پر راک فیلر تعلیمی بورڈ نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہو جس پر ۵۰،۰۰۰ ڈالر خرچ کئے جائیں گے،

اساتذہ کے خلاف یہ شکایتیں ہیں، کہ وہ مضامین ایسے پڑھاتے ہیں، جن سے خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے، وہ معاشرتی حالات کو پیش نظر نہیں رکھتے، وہ نہ لڑکوں کی نطرت کا مطالعہ کرتے ہیں، اور نہ ان سے محبت رکھتے ہیں،

عام طور سے اس پیشہ میں جو لوگ ہیں، وہ اور پیشوں کے لوگوں کے مقابلہ میں معمولی ہیں، ان میں زیادہ تر اعصابی امراض اور ذہنی خلجان کے شکار ہوتے ہیں، اس کے اسباب یہ ہیں، (۱) ان کی تنخواہیں بہت ہی قلیل ہیں، عام طور سے ان کی تنخواہ ۱۲۰۰ ڈالر سالانہ ہوتی ہے، گاؤں کے اساتذہ ۲۳۸ ڈالر سالانہ پاتے ہیں، (۲) ان کو ذہنی اطمینان نصیب نہیں ہوتا ہے، وہ ملازمت میں آٹھ کر ۱۲ سال تک ٹکتے ہیں، (۳) ان کو جنسی سکون بھی حاصل نہیں ہوتا ہے، اس پیشہ کی عورتوں کو شادی کی اجازت نہیں ہوتی ہے، اس حیثیت سے مرد بھی زیادہ خوش نہیں ہیں،

پھر بھی معلمی کا پیشہ باعزت سمجھا جاتا ہے، اور ہر سال ایک لاکھ اساتذہ تیار کئے جاتے ہیں، ان کے لئے بارہ سو مختلف ادارے ہیں، عام طور سے اس پیشہ میں وہ گریجویٹ داخل ہو جاتے تھے، جو کالج سے لبرل تعلیم پا کر نکلتے تھے، اس میں شک نہیں کہ وہ معلمی کی تعلیم پاتے تھے لیکن یہ تعلیم

بالکل ناکافی تھی، چنانچہ اب ان کو پانچ سال کی تعلیم الگ دیجائے گی جس میں کلچرل تعلیم کے ساتھ وہ لڑکوں کے نفسیات کا مطالعہ زیادہ کرین گے، اور اس مدت میں ان کے ذہنی رجحانات اور قلبی جذبات کی نگرانی ہوتی رہے گی، اگر ان کے رجحانات اور جذبات معیار کے مطابق ہوئے، تو اس پیشہ کے لئے موزون قرار دیئے جائیں گے، ورنہ ان کو اپنی تعلیم کے سلسلہ کو منقطع کرنے پر مجبور کیا جائیگا،

دمہ کا نفسیاتی علاج

ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ماہر تحلیل نفسی نے دمہ کے ایک سو مریضوں کا کامیاب نفسیاتی علاج کیا ہے، اس کا خیال ہے، کہ بعض اوقات دمہ نفسیاتی صدمہ کی وجہ سے بھی ہوتا ہے چنانچہ جب اس کو دمہ کے مریضوں کی نفسیاتی تشخیص میں کسی صدمہ کا پتہ چلتا ہے، تو اس کا نفسیاتی علاج کرتا ہے، اور اس کو اس میں برابر کامیابی حاصل ہوتی جارہی ہے، اسی یونیورسٹی کے ایک دوسرے ڈاکٹر نے دمہ کی ایک نوجوان مریضہ کا علاج مصنوعی نیند سے کیا ہے، مگر اسکے تجربات ابھی تکمیل نہین ہوئے ہیں،

"ص ع"

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں رہتا اور اسوجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولینا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالبعلموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عمر

"مینیجر"

ادبیات

تابشِ سہیل

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی

یا برقِ قضا گر کے نشیمن کو جلا دے
یا شعلۂ گل اٹھ کے اُسے درسِ فنا دے
کوئی تو جگر سوزیٔ بلبل کا صلہ دے
کوئی تو اسے پھونک کے اکسیر بنا دے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

معلوم ہے صیاد کے گلچیں کے ارادے
کیا تاب جو کوئی مجھے مقصد سے ہٹا دے
ہمت مری بگڑی ہوئی ہر بات بنا دے
بازو میں اگر قوتِ پرواز خدا دے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

کب فکر نشیمن سے ہے مقصد مرا آرام
کوشش میں جو لذت ہے وہ خود اسکا ہے انعام
ہمت کیلئے ننگ ہے اندیشۂ انجام
اسکی مجھے پروا نہیں، اے گردشِ ایام

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

صیاد ستمگر نے کبھی دادِ جفا دی،
شعلوں کو کبھی شاخ نشیمن نے ہوا دی
خود اپنے ہی نغمون نے کبھی آگ لگا دی
بلبل اسی انجام کی مدت سے ہے عادی

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ڈرتے ہیں مصائب سے کہیں طائر آزاد
پڑتی ہی رہا کرتی ہے افتاد پہ افتاد

شعلوں سے بھڑکتے نہیں مرغانِ چمن زاد — اپنا ہو کہ بیگانہ ہو، گلچیں ہو کہ صیاد

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے،

ہر طائرِ آزاد ہے اس راز کا محرم — کرنی ہو غلامی تو ہے جنت بھی جہنم

دو تنکے کسی طرح سے کر لیں گے فراہم — یہ جوشِ عمل اپنا سلامت ہے تو کیا غم

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

صیاد کا بھی خوف ہے بجلی کا بھی کھٹکا — بلبل ہے کہ تنکے ہی لئے جاتی ہے یکجا

جس کام کو چھیڑا اسے کیوں چھوڑ دے ادھورا — تکمیل پہ جو حشر ہو، اس کی نہیں پروا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مانا کہ قفس میں ہے بہت چین میسّر — نے برقِ چمن سوز، نہ صیاد ستمگر

ہے زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر — قابو میں رہے اپنے پر و بال تو کیا ڈر

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

گائیں گے ہم آزادیٔ گلشن کا ترانہ — بیکار ہے اے برقِ بلا ہم کو ڈرانا

کافی ہے بہت وسعتِ صحرائے زمانہ — ہم اور کہیں ڈھونڈ نکالیں گے ٹھکانا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ترکہ میں ملا ہے ہمیں ایمانِ براہیمؑ — کب آگ سے ڈرتے ہیں غلامانِ براہیمؑ

دنیا کو دکھا دینی ہے پھر شانِ براہیمؑ — ہر شعلہ کھلائے گا گلستانِ براہیمؑ

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ہے گوشۂ دل رو کشِ صد وادیٔ ایمن — بجلی سے ڈریں کیا کہ ہے پروردۂ دامن

اس راکھ کے ہر ذرہ سے کھل جائیں گے گلشن — بیکار نہ جائے گی مری خاکِ نشیمن

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ہے بازوؤں میں قوتِ پروازِ خداداد — کیوں جھیلئے پھر ننگِ نمک خواریٔ صیاد

سب کچھ ہے اگر اپنے پر و بال ہیں آزاد — مشتِ خس و خاشاک کو کر دے کوئی برباد

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

سو نسبت ہے جو باغِ کہن دیس ہے میرا — ہر سو ہے اسے غم کی گھٹاؤں نے جو گھیرا

میں اور کسی شاخ پہ کر لوں گا بسیرا — ہو دور کسی طرح تو گلشن کا اندھیرا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

آدم نے یہیں خلد سے کی آ کے اقامت — خواجہ نے دکھائی ہیں یہاں فن کی کرامت

اللہ رے یہ چمنِ کہنہ سلامت — ہر چند مری جان پہ آ جائے قیامت

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

جان اس وطنِ خواجہ و جیپال پہ صدقے — دل اس چمنِ حشمت و اجلال پہ صدقے

سر مشہدِ آزادی و اقبال پہ صدقے — کر دیں گے اسے اپنے پر و بال پہ صدقے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے،

ہو معرکہ ہر چند بہت اہلِ جفا سے، — جانبازِ وطن ڈرتے ہیں کب دشتِ فنا سے

ہٹنے کے نہیں مسلکِ تسلیم و رضا سے — جو کچھ بھی گذرنی ہے گذر جائے بلا سے

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مانا کہ نشیمن کا مخالف ہے زمانہ — مانا کہ یہی ایک ہے بجلی کا ٹھکانا

اس راز سے واقف ہے مگر طائرِ دانا — ہو جائیں گے محنت سے پر و بال توانا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

باب التقریظ والانتقاد

مسلمانون کا روشن مستقبل[1]

از

جناب مولوی سید طفیل احمد صاحب منگوری علیگ

سید طفیل احمد صاحب ہماری قوم کے ان باقیاتِ صالحات میں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کے تمام نشیب و فراز اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، اور ہماری جدید قومی تاریخ کی زندہ کتاب ہیں، اور عمر کی اس قدامت کیساتھ سیاسی خیالات اور قومی خدمت کے ولولہ کے اعتبار سے جوانوں سے زیادہ باہمت ہیں، یہ کتاب اسی جذبہ کا نتیجہ ہے،

عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے ہندوستان کے مسلمانون پر جو جمود اور انحطاط طاری ہوا، وہ اب تک قائم ہے، اور وہ ہر میدان میں اپنی ہمسایہ قوم سے پیچھے ہیں، اس زبون حالی کا رونا سنتے سنتے اب خود مسلمانوں کو بھی اپنی درماندگی کا یقین ہوگیا ہے، دوسری غلط شہرت یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک سے کوئی دلچسپی نہیں، اور وہ ملکی آزادی کی جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں لیتے، تیسرا خوف بعض جماعتوں میں یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانون کی انفرادی قومیت اور ان کے حقوق محفوظ نہیں،

[1] ضخامت ۲۰۶ صفحے قیمت مجلد ۲ر علاوہ محصول ڈاک، پتہ :- نظامی پریس بدایوں،

سید طفیل احمد صاحب نے ان تینوں امور کی تردید اور مسلمانون میں اپنی برتری کا احساس اور جوش عمل پیدا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں دکھایا ہے، کہ کسی دور میں مسلمانوں میں جمود اور غفلت نہیں رہی، ہر زمانہ مین ان کے مصلحین اور مجاہدین ان کی صلاح و فلاح کے لئے سرگرم عمل رہے، اور ملکی سیاست میں مسلمانوں کا قدم کسی قوم سے پیچھے نہیں رہا، اور ہندوستان میں ان کے حقوق بالکل محفوظ اور ان کا مستقبل روشن ہے،

اس کے ثبوت کے لئے انھوں نے حکومت پر رعایا کے دس حقوق قرار دیئے ہیں، (۱) روٹی کا مسئلہ، (۲) حفاظت جان و مال (۳) عدل و انصاف (۴) مذہب کی حفاظت (۵) تہذیب و زبان کا تحفظ (۶) تعلیم (۷) ملازمت کے حقوق (۸) شہری حقوق میں مساوات (۹) حقوق ملکیت میں آزادی (۱۰) سیاسیات،

پھر ان دسوں حقوق کی حالت کو اسلامی عہد، ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اور خالص برطانوی شہنشاہی کے زمانہ میں دکھا کر موجودہ دستور کی رو سے دکھایا ہے، کہ مسلمانون نے اپنے دور میں یہ حقوق کس عدل و انصاف سے پورے کئے، اور ہندو اور مسلمان دونوں ان کو یکساں متمتع ہوئے پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں کس ظالمانہ طریقہ سے انھیں پامال کیا گیا، اس سلسلہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم کی پوری تاریخ آگئی ہے، پھر خالص تاج برطانیہ کے دور میں جو آزادی اور مساوات کا دور کہلاتا ہے، کس طرح مسلمانوں کے حقوق کو نظرانداز کیا گیا، اور ابتدا میں انھیں ہر طرح سے پامال کرنے کی کوشش کی گئی، پھر رفتہ رفتہ پالیسی بدلی، اور مسلمانوں کے حال زار پر بھی توجہ ہونے لگی، اس بحث میں ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کے تغیرات کی پوری تاریخ آگئی ہے، آخر میں جدید دستور میں مسلمانوں کے حقوق دکھائے گئے ہیں،

ہندو اور مسلمانون کی اس مشترکہ تاریخ کے ساتھ ہر دور کی خاص مسلمانوں کی مذہبی اصلاحی

اور تعلیمی تحریکون اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً سرسید احمد خان کے تعلیمی اور اصلاحی
خدمات کو تفصیل کیساتھ دکھایا گیا ہے، اور اس کے مضر اور تاریک پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھایا
گیا ہے، کہ ابتدار میں ان کے سیاسی خیالات کیا تھے، پھر ان میں کس طرح تغیر پیدا ہوا، اور رفتہ
رفتہ کس طرح مسلمانوں کی سیاسی باگ، علی گڑہ کالج کے انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں آگئی،
یہ بحث خصوصیت کیساتھ پڑھنے کے لائق ہے، جسکے سید صاحب عینی شاہد ہیں،

سیاسی جد و جہد کے سلسلہ میں ہندوستانیوں کے سیاسی شعور سے لیکر اسوقت تک ہندو
مسلمانوں کی مشترک سیاسی اور خاص مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں اور مجلسوں کی تاریخ
کیا تھی سیاسی جد و جہد میں مسلمانوں کا حصہ دکھایا گیا ہے، اس میں علمائے کرام کے سیاسی اور دینی مجاہدات
کی تفصیل بھی آگئی ہے غرض مسلمانوں کی قومی مذہبی اور سیاسی زندگی کا کوئی مسئلہ اور کوئی پہلو چھوٹنے
نہیں پایا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی تین سو سال کی مذہبی
سیاسی تعلیمی، اور اقتصادی تاریخ پر نہایت جامع تبصرہ ہے، اور اس موضوع پر اردو مین ابتک
ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے،

لیکن مصنف نے ایک خاص مقصد اور نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی ہے، اس لئے اس کی حمایت
بین کتاب کے مباحث میں اعتدال اور توازن قائم نہیں رہ سکا ہے، کتاب کے تمام مباحث
اور آخری ابواب میں تناسب نہیں ہے، تاریخی معلومات اور دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے
یہ کتاب جتنی جامع اور مکمل ہے، نتائج کے اعتبار سے اتنی تشفی بخش نہیں ہے، آخری ابواب جو اس
ساری داستان کا خلاصہ اور نتیجہ ہیں، جنھیں سب سے زیادہ پر زور اور مدلل ہونے چاہئیں تھے کمزور ہیں،
ایک مخالف کہہ سکتا ہے کہ سوال مسلمانوں کے دستوری اور قانونی حقوق کا نہیں، بلکہ اس کے مراعات
و نتائج اور عمل کا ہے، اصولاً تو انگریز بھی ہندوستان کی آزادی کو مانتے ہیں لیکن عمل کیا ہے،

ایسی حالت میں محض دستور کے عطا کردہ اختیارات مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت نہیں ہو سکتے، او
تعلیم و زبان کے مسائل میں بعض ارباب حکومت کے طرز عمل سے یہ شبہہ کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا،

کتاب کے آخری حصہ کے معلومات میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی ہے، جزوی واقعات اور
اخباری اطلاعوں پر کلیے قائم کرلئے گئے ہیں، کاش یہ کتاب نتائج کے اعتبار سے بھی ایسی مضبوط ہوتی
کہ مخالفین کے لئے حرف گیری کی گنجائش باقی نہ رہتی، لیکن یہ چیز مؤلف کے بس ہی کی نہ تھی جس حد
تک ان کے اختیار کو دخل تھا، اس حد تک انھوں نے اسکو بہتر سے بہتر شکل میں پیش کیا ہے، لیکن اس
خامی کی وجہ سے کتاب کی اہمیت اور خوبی میں کوئی فرق نہیں آتا، اس خامی کو چھوڑ کر اور حیثیتوں سے
اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، "م"

انڈیا آفس لائبریری
کی
فارسی قلمی کتابون کی فہرست جلد دوم

انڈیا آفس لائبریری کی قلمی کتابون کی فہرست جلد اول ۱۹۰۳ء میں مشہور فاضل ڈاکٹر ایتھے نے
مرتب کی تھی، اب دو برس ہوئے کہ اسکی دوسری جلد ۱۹۳۷ء میں چھپ کر نکلی ہے، اس دوسری جلد
کو ڈاکٹر ایتھے نے ناتمام چھوڑا تھا، اسکی تکمیل اور نظر ثانی کا کام ایڈورڈ ایڈورڈس صاحب ایم اے نے کیا
ہے، اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے چھاپا ہے، قیمت للعہ ہے،

اس دوسری جلد کے شروع میں چند صفحوں میں مختلف علموں کی بعض چھوٹی ہوئی یا بعد کو
ہوئی قلمی کتابوں کی تفصیل ہے، ان کتابوں میں سب سے نادر اور کمیاب جس نسخہ کو بتایا گیا ہے وہ مولینا رومی
کی فیہ ما فیہ نمبر ۲۰۴۳ ہے مگر خوش قسمتی سے یہ کتاب ہمارے دوست مولینا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ہمت اور
محنت سے ۱۹۲۹ء میں دار المصنفین کے مطبع معارف سے چھپ کر نکل چکی ہے،

سب سے قابلِ قدر کتاب اس میں جامع التواریخ رشید الدین نمبر ۴۳۰۰ کا وہ حصہ ہے جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے، اور جس کا عنوان "تاریخ ہند و سند و کشمیر" ہے،

گنجینۂ جعفر زٹلی نمبر ۳۰۵۴ کے نام سے جعفر زٹلی کے "خرافات" کا مجموعہ ہے، جس میں فارسی اور اردو میں جعفر زٹلی کے ہجویات محفوظ ہیں، جعفر زٹلی شاہ عالمگیر کا معاصر تھا، اس مجموعہ میں ایک ہجو شہزادہ کام بخش بن عالمگیر کی، دوسری خود عالمگیر کی، تیسری خان جہاں کی چوتھی ذوالفقار خان کی، ایک مرثیہ عالمگیر کا مذکور ہے،

ایک خاص قابلِ ذکر کتاب عطریہ نورس شاہی نمبر ۳۰۰۷ ہے، اس کا موضوع عطرسازی ہے، اس میں مختلف قسم کی خوشبو بنانے کی ترکیبیں لکھی ہیں، مصنف کا نام نظام الدین محمود ترسان بن مولینا حبیب اللہ شریفی ہے، یہ سلطان عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی،

نمبر ۳۰۵۰ پریغما یا خوان یغما کے نام سے عربی فارسی اور ہندوستانی بلکہ دکھنی کا ایک لغت نصاب الصبیان کے طور پر ہے،

آخری مغل سلطنت کے بوقلموں تمدن کی دو یادگاریں ذکر کے قابل ہیں، ایک خلاصۃ العیش عالم شاہی نمبر ۳۰۵۸ جو عالم شاہ کے زمانہ میں معالجات طبِ جنسی کے موضوع پر لکھی گئی ہے، اور دوسری تائید بصارت نمبر ۳۰۵۹ شمشیر شناسی اور شمشیر بازی کے فن پر تالیف ہوئی ہے، مصنف کا نام مرزا لطف اللہ نثار ہے، محمد شاہ کی خدمت میں رہتے تھے،

اسکے بعد اس فہرست کے اصلی مضامین ہیں، جو تین حصّوں میں ہیں، پہلے حصّہ میں کتابوں کے نمبروں کی تفصیل ہے، دوسرے حصّہ میں کتابوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر ہیں، اور تیسرے حصّہ میں انہی کتابوں کے نام تاریخی ترتیب سے درج ہیں، یہ گویا فہرست کی فہرست ہے، اس سے ہر کتاب کا پتہ مختلف ذریعوں سے باسانی معلوم ہوسکتا ہے، غرض یہ ہے کہ ڈاکٹر ایتھے نے اپنی فہرست کی تالیف میں جو محنت اٹھائی ہے، اور کدوکاوش کی ہے، وہ ہر صاحب علم کے شکریہ کی مستحق ہے،

"س"

مطبوعاتِ جدیدہ

فاتحہ تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان (عربی) از مولینا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ تقطیع بڑی ضخامت ۶۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۲ر پتہ:- دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر (اعظم گڈھ)

مولینا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے آیاتِ قرآنی کے ربط و نظم اور ترتیب اور تفسیر القرآن بالقرآن کے پہلو سے کلام پاک کی جو تفسیر لکھی ہے، یہ رسالہ اس کا فاتحہ ہے، اس میں ان دونوں پہلوؤں سے کلام اللہ پر غور و فکر اور اس کی تفسیر و تاویل کے اصول و طریقے بتائے گئے ہیں اور جن جن پہلوؤں سے ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ان کی تشریح کی گئی ہے، یہ سترہ پہلو یا مقدمات ہیں، شانِ نزول کی حقیقت، اور اس سے مراد، تفسیر کے اخباری ماخذ، لغوی اور لسانی پہلو، مختلف آسمانی صحیفوں کی زبان اور اسلوبِ بیان کی ایک دوسرے سے تشریح، قرآن کی دلالتیں قطعی ہیں، آیات میں مناسبت و ترتیب، ہر سورہ کا ایک مستقل نظام ہے، قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کے حقائق اور احکام کا تقابل، سورتوں کی مقدار تعلیمات، قرآن کے موضوع، معروف و منکرات، ہر آیت کی ایک خاص دلالت ہے، نظام قرآنی کے اجزا، سورتوں کے ناموں کا تعلق عمود سورۃ ہے، محتمل الوجوہ خطابات قرآنی کی تعیین، نزول قرآن کی کیفیت، قرآن کی تفسیر حدیث سے ان تمام مقدمات کی پوری تشریح و تفصیل کی گئی ہے، جس کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہوسکتا ہے، ان میں سے بیشتر مقدمات تفسیر

کے معمول بہا ہیں، بعض مصنف کے وجدان اور برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں، یہ رسالہ ہر صاحب علم خصوصاً ان لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جنھیں تفسیر قرآن سے ذوق ہے، اس کے آخر میں بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے، یہ دونوں تفسیریں مصنف کے وجدانی لطائف و نکات، اور اسرار و حکم سے مملو ہیں، جو اس کا مخصوص حصہ ہے،

طلسم حیات از جناب ماہر القادری، تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۱ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ مجلد، پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز، تاجران کتب کشمیری بازار بل روڈ لاہور،

طلسم حیات جناب ماہر القادری کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے، یہ افسانے حسن و عشق کی عام اور پامال شاہراہ سے الگ ہیں جن کا عموماً کوئی مقصد نہیں ہوتا، بیشتر افسانوں میں قادری صاحب نے سوسائٹی یا افراد کے قابل اصلاح پہلوؤں پر دلچسپ تنقید کی ہے، یا کسی اخلاق سبق کو پیش کیا ہے، اس خشک مقصد کے باوجود کل افسانے دلچسپ ہیں، بعض محض تفریحی ہیں لیکن وہ بھی لطف سے خالی نہیں، ممکن ہے فنی نقطہ نظر سے ان میں خامیاں ہوں، لیکن مقصد کے لحاظ سے بہتر اور حسن مذاق کے اعتبار سے کامیاب ہیں،

شہری آزادی مصنفہ جناب ڈاکٹر رام منوہر صاحب لوہیا، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲، صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴ر، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور، لکھنؤ،

سیاسی دنیا میں شہری آزادی یا حقوق شہریت بہت اہم شے ہے، حاکم و محکوم کی کشمکش زیادہ تر حقوق شہریت کے تحفظ ہی کے لئے ہوتی ہے، ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ نہایت اہم ہے لیکن اسکی اہمیت کے باوجود عام طور پر لوگ اسکے مفہوم و مقصود سے واقف نہیں ہیں، اس رسالہ میں مؤلف نے اس کے حدود اور مفہوم و منشا کو بتایا ہے، اور امریکہ، فرانس اور انگلستان میں اسکی تاریخ اسکے

حصول و تحفظ کی جد و جہد اور اسکی موجودہ حالت پر روشنی ڈالی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آزاد ملکوں میں بھی اب تک حقوق شہریت کے حدود کی تعیین میں حاکم و محکوم میں کشمکش جاری ہے آخر میں ہندوستان میں ان حقوق کی حالت دکھائی گئی ہے،

کیوں اور کیسے مؤلفہ جناب عظیم بیگ صاحب چغتائی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ مجلد، پتہ:- نظامی پریس بدایوں،

اس مفید کتاب میں مؤلف نے بچوں کے لئے روزانہ کے واقعات و مشاہدات میں سائنس کے ابتدائی مسائل بتائے ہیں، بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے بعض مفید سبق اور مختلف قسم کے دلچسپ اور مفید معلومات ہیں انداز بیان سادہ آسان اور دلچسپ ہے، یہ کتاب بچوں کیلئے بہت مفید ہے،

سخنوران دکن مؤلفہ جناب تسکین عابدی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۸۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت ۸ر، پتے:- (۱) مکتبہ ابراہیمیہ (۲) احمد حسین جعفر علی تاجر کتب چار مینار، (۳) مکتبہ علیہ چار مینار، حیدرآباد دکن،

جناب تسکین عابدی نے عہد عثمانی کے دکن کے شعراء کے حالات میں یہ تذکرہ مرتب کیا ہے، اس میں ان غیر دکنی شعراء کو بھی جگہ دیگئی ہے، جو کسی سلسلہ میں حیدرآباد میں مقیم ہیں، اسلئے شمالی ہند کے شعراء کی بھی خاصی تعداد آگئی ہے، اس میں چھ سو شعراء کے مختصر حالات، اور ان کے کلام کے نمونے ہیں شاعرات کی بھی معتدبہ تعداد ہے، ظاہر ہے کہ ایک مختصر تذکرہ میں چھ سو شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کی گنجایش کہاں تک ہوسکتی ہے، اس لئے بیشتر حالات اور کلام کے نمونے محض برائے نام ہیں، تاہم اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا، کہ اس دور کے تمام دکنی شعراء کے حالات قلمبند ہوگئے ہیں جو آیندہ تذکرہ نگاروں کیلئے کارآمد ہوں گے،

ٹیگور اور ان کی شاعری، مؤلفہ جناب مخدوم محی الدین صاحب بی اے،

عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عمر پتہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں مؤلف نے رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا ہے اور ان کی شاعری کے طبعی اسباب و محرکات، اس کے تدریجی ارتقاء، اس کے مختلف پہلوؤں اور دوروں کی خصوصیات پر تبصرہ ہے اور مذہب، سیاست، قومیت، وطنیت، تہذیب و معاشرت اور تعلیم وغیرہ، تمدن کے جملہ اجزاء کے متعلق ٹیگور کے خیالات اور ان کی تعلیمات کو پیش کیا ہے، اور ان کی مشن پر روشنی ڈالی ہے ہر دور کی شاعری اور اہم تصانیف پر مختصر ریویو ہے،

قطرات شبنم از جناب گوردھن داس صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۰ صفحے، کاغذ کتابت، و طباعت بہتر، قیمت مجلد عمر، پتہ:- گوردھن داس بی اے بیڈن روڈ لاہور،

آج کل کے نوجوانوں میں ادب لطیف یعنی شاعرانہ نثر میں تخیلی مضامین کا بڑا ذوق ہے لیکن اس صنفِ ادب کیلئے بڑے لطیف ذوق شاعرانہ نگاہ اور فلسفیانہ تفکر کی ضرورت ہے اور وہ بالکل مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں جس کے نمونوں سے آج کل کے رسالے بھرے رہتے ہیں قطرات شبنم جناب گوردھن صاحب کے مختصر شاعرانہ اور تخیلی مضامین کا مجموعہ ہے، اور آج کل کے بے معنی ادبِ لطیف کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے، مصنف کا ذوق ستھرا ہے اور ان میں ترقی کی کافی صلاحیت ہے،

"م"

جلد ۴۳ | ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۹ء | عدد ۵

مضامین